

2020ء

اگست

ماہنامہ انٹرنیشنل

لاہور

ایڈیٹر
منزہ خان

سروپرست اعلیٰ
و چیف ایڈیٹر
محی الدین عباسی

بیک وقت "انگریزی" اور "اردو" زبان میں لندن سے شائع ہونے والا جریدہ

ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل: ادبی، سیاسی، سماجی و مذہبی سرگرمیوں کا ترجمان

www.lahoreinternational.com

Advance
HAPPY

Independence 

DAY

to all.....



www.YouTube.com/lahoreinternational



Your favourite Monthly Magazine

Lahore International

is relaunching its **YouTube** Channel

Subscribe now for great content!!

Where we go deep into the streets of Pakistan to bring you exclusive enjoyable content.

Head over to **YouTube** and check it out

ZING MAAR

EASY TO FOLLOW
UNIQUE RECIPES FROM
AROUND THE WORLD

FOLLOW @ZINGMAAR



اس شمارہ میں

دہری قلاد کنگریز	04
تعصب، نفرت معاشرے کو تباہ کر دیتا ہے	05
تصور پاکستان خوب یا حقیقت	06
و سعیت اللہ خان کا کالم بات سے بات: مندرجہ بیں ہے گا!	09
بلوچ تاریخ کی غالی جگہیں اور مخالفے	11
اپنے پھون کو پہ جی گیم کھیلنے سے منع کریں	13
اُدھر تم۔ ادھر ہم	14
فوچی ٹکونے	15
لال مسجد آپریشن کے 13 سال	18
قوى اسلامی کی منتظر کردہ حالیہ قرارداد	21
کشیر یہ لہو چھپائے نہ چھپے گا، یہ بغاوت دبائے نہ دبے گی	22
داداں اور رحمان ڈکیت سے عزیز بلوچ تک	26
تاریخ چینیوں	31
ہم آج بھی جگنی سے باہر نہیں آتے	34
سراج الدولہ: وہ شخص جس کے وحشیانہ قتل کے بعد ہندوستان پر اگر بیڑوں نے 180 سال تک راج کیا	36
*وادی گالوان * *ایک دلچسپ معلومات*	39
خاطر لکھن بیں اب تو مضمونی اختلاف	40
آیا صوفیہ تاریخ کے آئینے میں تاریخی واقعات	42
آیا صوفی کی میوزیم کی حیثیت ختم	44
انسانی ڈھانچوں کے بنے پر ہائل جرچ کی اصل کہانی	46
مہاراجر نجیت سگھ کے بارے میں	47
پاکستان تو نصیلت جزل جدہ	48
پاکستانی ایگزیکٹیو فورم کی نیوز	49
وہ درخت جس نے کروڑوں انسانی زندگیاں چانے میں مدد کی گر خود معدومیت کا ڈکار ہوا	50
قریانی کی روح اور مذہبی دوستگردی	53
قوموں کی تباہی کے محکمات میں سے ایک محک	56
کرم عبدالکریم قدسی صاحب کا خصوصی امنڑو یو	58
اردو پڑھانے سے دل ہی انھی گیا سجاد	60

ADVERTISEMENT TARIFF

(Effective : January 01, 2018)

	Monthly	Quarterly	Half Year	Yearly
Full Page	150	420	800	1530
Half Page	90	250	540	920
Quarter	50	140	270	510

(Price in UK Pound Currency)

خدا تعالیٰ کے فضل و حم کے ساتھ
ہوا ناصر

بعد از خدا البعض محمد محمد گرگراں بو دمحمد اسخت کافم



علمی، ادبی، سیاسی، معاشی، معاشرتی و مذہبی سرگرمیوں کا عالمی مجلہ

جلد نمبر: 3 شمارہ نمبر 1 جمادی الاول 1441 جنوری 2020ء

زیر انتظام

عباسی اکیڈمی

سرپرست اعلیٰ و چیف ایڈیٹر

محی الدین عباسی

ہمارے نمائندگان

سید مبارک احمد شاہ (ہاروے)
+47-91698367

عرفان احمد خان (جمیں)
+49-1711974701

ظہیر الدین عباسی (جمیں)
+49-15212005548

محمد سلطان قریشی (کینیڈ)
+41-6433112

عبد الشعون چاند (سعودی عرب)

قیمت فی شمارہ: 2 پاؤ نڈ

website : lahoreinternational.com

این تحریریں اور تیکنی آراء درج ذیل ای میل پر بھجوائیں:

lahoreintlondon@gmail.com

m.abbasi.uk@gmail.com

ماہنامہ لاہور میگزین انٹرنشنل آپ کا اپنارسالہ ہے
اس کی اشاعت و ترویج میں بھرپور حصہ ڈالیے۔

دُرْس قَرآنِ نَكْرَز



إِذْ قَالَ اللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّ مَرْيَمَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ أَتَخْدُونِي وَأُمِّي إِلَهُي مَنْ دُونِ اللَّهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَقُولُ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ إِنْ كُنْتُ قُلْتُمْ فَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا آمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبُ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ إِنْ تَعْذِبُهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمَ يَنْفَعُ الصَّدِيقِينَ صَدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّتُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَرُ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ بِلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

(سورۃ المائدۃ آیت ۱۱۷) (119)

ترجمہ: اور (یاد کرو) جب اللہ عیسیٰ ابن مریم سے کہے گا کہ کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا دو معبد بنالو؟ وہ کہے گا پاک ہے تو۔ مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ ایسی بات کہوں جس کا مجھے کوئی حق نہ ہو۔ اگر میں نے وہ بات کہی ہوتی تو ضرور تو اسے جان لیتا۔ تو جانتا ہے جو میرے دل میں ہے اور میں جانتا جو تیرے دل میں ہے۔ یقیناً تو تمام غیبوں کا خوب جانے والا ہے۔ میں نے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہا جو تو نے مجھے حکم دیا تھا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ اور میں ان پر نگران تھا جب تک میں ان میں رہا۔ پس جب تو نے مجھے وفات دے دی، فقط ایک تو ہی ان پر نگران رہا اور توہر چیز پر گواہ ہے۔ اگر تو انہیں عذاب دے تو آخر یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں معاف کر دے تو یقیناً تو کامل غالبہ والا (اور) حکمت والا ہے۔ اللہ نے کہا یہ وہ دن ہے کہ سچوں کو ان کا سچ فائدہ پہنچانے والا ہے۔ ان کے لئے جنتیں ہیں جن کے دامن میں نہیں بہتی ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اللہ ہی کی بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین کی اور اس کی بھی جوان کے اندر ہے اور وہ ہر چیز پر جسے وہ چاہے دامنی قدرت رکھتا ہے۔

نشرت: (۱) اس آیت کریمہ میں ذکر ہے کہ حضرت مسیح بر佐ز قیامت کہیں گے کہ ”میں نے کبھی بھی لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا معبد بنالو“ یہ بات بابل سے قطعی طور پر ثابت ہے۔ ایک بھی آیت انجلیں میں ایسی نہیں جس میں مسیح نے کہا ہو کہ مجھے اور میری ماں کو خدا کے سوا معبد بنالو بلکہ جب شیطان نے آپ کو آزمائے کے لئے کہا کہ مجھے سجدہ کرو تب بھی آپ نے جواباً نہیں فرمایا کہ تم مجھے سجدہ کرو۔

(۲) اس آیت کریمہ میں عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کا صراحتاً ذکر ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ رہے ان کی اپنی قوم (بنی اسرائیل) میں شرک نہیں پھیلا۔ جب آپ فلسطین سے ہجرت کر گئے تو سینٹ پال (Sain Paul) نے یونانیوں کو جو بنی اسرائیل نہیں تھے گمراہ کیا اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبد بنالیا۔ بنی اسرائیل جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم دعوت تھی ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں شرک نہیں پھیلا۔

(۳) اس آیت کی رو سے حضرت مسیح علیہ السلام نے بڑی حکمت سے گنہگاروں کی بخشش کی دعا کی ہے کہ اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر معاف فرمادے تو تو کامل غالبہ والا اور حکمت والا ہے۔



مدیر اعلیٰ محبی الدین عبایی

اداریہ

تعصُّب، نفرت معاشرے کو تباہ کر دیتا ہے

تعصُّب، نفرت اور عصیت زمانہ جاہلیت کی پیداوار ہیں، بلکہ یہ انتہا پسندی کا دوسرا نام ہے۔ یہ نفرت، تفرقہ، گمراہی اور بعض کو بڑھادیتا ہے اور تعصبات حق و انصاف اور اصول پسندی کے شمن ہیں۔ کوئی معاشرہ اس سے باہر نہیں رہ سکتا، اسی لئے ہر انسان اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ تعصُّب کی مریٰ اور غیر مریٰ لا عدالت ٹکلیں ہیں۔ دنیا کے اکثر علاقوں اور خصوصاً پاکستان میں تعصُّب کو فروع حاصل ہوا ہے۔ اخبارات اور سوشل میڈیا پر آئے دن ہم پڑھتے رہتے ہیں کہ فلاں مذہبی جماعت یا فرقہ کے افراد کو روزمرہ کے معمولات ادا کرتے ہوئے بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ نفرت اور تعصُّب کی بنیاد پر کم جولائی ۲۰۲۰ کو شیخوپورہ میں ایک واقعہ پیش آیا قبریں توڑ دی گئیں اس کے بعد دوسرا واقعہ ۱۳ جولائی کو گجرانوالہ کے ایک احمدیہ قبرستان میں پیش آیا۔ جس میں ۲۰ سے زائد قبروں کی بے حرمتی کی گئی بعض تعصُّب اور نفرت کی آگ میں جلنے والے متعدد افراد تو انسانوں کو مرنے کے بعد بھی نہیں بختے ہیں۔ تعصُّب اور نفرت کیوں بردا جاتا ہے؟ اور اس روایہ کو تبدیل کرنا اس قدر مشکل کیوں؟

جب ہم کسی کو متعصُّب قرار دیتے ہیں تو دراصل ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص ایک خاص روایہ کا حامل ہے جو فلاں چیز، قوم یا فرقہ کے متعلق نفرت پر منسی ہے اور یہ نفرت مذکورہ شخص کے اندر راست ہو چکی ہے۔ معنوی اعتبار سے تعصُّب کا مطلب ہے کسی کے متعلق فیصلہ صادر کر دینا اور غصب، غصہ، مکالہ اور تبدیلی کا امکان ختم کر دینا۔ یعنی نتیجہ نکالا جا چکا ہے۔ تبادل حقائق اور وضاحتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

تعصُّب اور نفرت کی کئی شکلیں ممکن ہیں جن میں کچھ نسبتاً کم منفی ہوتی ہیں۔ ہم کسی مظلوم کے حق میں بھی متعصُّب ہو سکتے ہیں۔ انتہائی سطح کی حبِ الوطنی اپنے وطن یا قوم کے حق میں ایک طرح کا تعصُّب ہی ہوتی ہے۔ ”غلط یاد رست، حق پر ہے یا غلطی پر زیہ میرا ملک ہے، مجھے اسی کی حمایت کرنی ہے۔“ اس فقرے سے ہم سب کی سماعیں آشائیں۔ اس روایہ کا حامل شخص اپنے ملک یا اپنی پسندیدہ حکومت کی ہر قیمت پر حمایت کرتا ہے۔ لیکن نفیات دنوں کی اکثریت متفق ہے کہ تعصُّب بنیادی طور پر ایک منفی جذبہ اور سوچ ہے۔ یہ کسی گروہ کے لئے ناپسندیدگی، منافر ت اور دشمنی کا جذبہ ہے، محض اس لئے کہ اس گروہ کے ارکان کسی مخصوص شناخت سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا انہیں قابل نفرت قصور کر لیا گیا ہے۔

دل صاف کرنے کا طریقہ: معروف سماجی سائنسدان ہربرٹ بلمر

(1961) کا کہنا تھا کہ متعصُّب اکثریتی گروہ میں چار جذبے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ (۱) وہ اقلیتی گروہ سے فطری طور پر بہتر ہیں (۲) اقلیتی گروہ اپنی خصوصیات میں مختلف اور اجنبی ہے (۳) سہولیات، طاقت، حیثیت اور وقار پر اکثریتی گروہ کا حق ہے، اقلیتی گروہ کا نہیں (۴) یہ نوٹ اور شک کہ اقلیتی گروہ ان کے مفادات کے خلاف سازشیں کر رہا ہے۔ اس حوالے سے تعصُّب ہمیشہ ایک مجموعی موقف کی نشاندہی کرتا ہے۔

تعصُّب اور نفرت ہمیشہ شدید جذبات، کثر عقا ند اور راست رویوں کی صورت میں اظہار پاتا ہے۔ کثر عقا ند کے حوالے سے بر تے جانے والے تعصُّب پر غور کر جئے۔ یہ ایک مذہبی شناخت کے متعلق مجموعی طور پر ایک منفی رائے قائم کر لی جاتی ہے اور اس کے ہر فرد کو اس گروہ سے منسوب خصوصیات کا حامل تصور کر لیا جاتا ہے۔ انسانوں کے درمیان پایا جانے والا تنوع بے تو قیرقرار پاتا ہے۔ اسی طرز احساس سے انتیازی سلوک جنم لیتا ہے۔ اس پر منطبق کی جانے والی اجتماعی منفی خصوصیات ہی سے جواز پاتا ہے۔ جمعہ ۱۱ مئی ۲۰۱۸ کو مسجد الحرام کے امام و خطیب شیخ ڈاکٹر صالح بن حمید نے اس ضمن میں خبردار کیا تھا کہ تعصُّبات اور نفرت خطرناک سماجی امراض ہیں۔ یہ انسانیت کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ یہ افراد، اقوام اور معاشروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یہ ایسی آفت ہے جب بڑھتی اور پھولتی ہے تو انسانوں کو تباہ و بر باد کر دیتے ہیں۔ تعصُّب کی ہوا چلتی ہے تو تعلیم یافتہ وغیرہ تعلیم یافتہ، مہذب و غیر مہذب، دیندار وغیرہ دیندار کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ غور کا سرچشمہ ہے، ظلم کی تحریک ہے، نفرت اور بد عنوانی کا بہت بڑا سبب ہے۔ قرآن کی تعلیم ہے کہ اگر کسی قوم سے شمنی بھی ہوتی بھی اس کے حقوق کا خیال رکھو اور اس کے ساتھ اپنے قضیتے چکاتے ہوئے انصاف کا دامن ہاتھ سے ہرگز نہ چھوڑو۔ خدا تعالیٰ نے تو ہمیں اس کی عبادت کے لئے تحملیق کیا ہے، وہ چاہتا ہے کہ بنی نواع انسان اس کی عبادت اور تعریف کریں اور انسان ایک دوسرے سے محبت کرے اور ایک دوسرے کے کام آئے انسان کی پیدائش کا تواصل مقصد یہی ہے جسکو ہم بھول گئے ہیں۔ مثل مشہور ہے، ”جو بیا ہے وہی کاٹو گے“ یا جیسی کرنی و لیسی بھرنی۔ آج ہمارا ملک پاکستان جن تعصُّب اور نفرتوں کا شکار ہے تاریخ گواہ ہے اس سے پہلے سیاسی اور غیر سیاسی لیڈروں نے انجام دیکھ لیا ہے۔ لہذا امور دنیا نے گزارش ہے کہ ہوش کے ناخن لیں اب بھی وقت ہے، ان تعصُّبات اور نفرتوں کو ختم کریں اور اصل پیدائش کا مقصد جو کہ خدا تعالیٰ کی عبادت ہے، کو سمجھیں ورنہ آپ رہیں گے، نہ ملک اور نہ معاشرہ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محبت سب سے اور نفرت کسی سے نہیں“ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



تصویر پاکستان خواب یا حقیقت



تحریر: ڈاکٹر صدر محمد

ووٹ دیئے، قربانیاں دیں، صعبوں میں برداشت کیں اور جسے قائدِ اعظم نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ وہ کیا خواب تھا جس کی تعبیر کے لئے عالمی تاریخ کی سب سے بڑی هجرت و قوع پذیر ہوئی اور مسلمان گھر بارٹا کر، بزرگوں کی قبروں کو چھوڑ کر اور ان گنت جانوں کی قربانیاں دے کر دیوانہ وار پاکستان چلے آئے۔ اس تصویر کو سمجھنے کے لئے ہمیں قائدِ اعظم کی شخصیت اور ان کی تقاریر، ان کے پیغامات اور وعدوں، پر نظر ڈالنی ہوگی۔ قائدِ اعظم کی شخصیت اور ان کے مزاج کو ذہن میں رکھ کر ان کی تقاریر پڑھیں تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی جیسے احساسات و تصورات ان کے ذہن پر نقش تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریریں ان الفاظ اور ترکیبات کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔ بدستی سے قائدِ اعظم کی شخصیت کے اس پہلوکی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اس لئے میں قائدِ اعظم کی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ 1939ء میں کی گئی تقریر کے چند فقرے نمونے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ انھیں پڑھیے اور ان الفاظ کے باطن میں جھاٹکئے تو آپ کو اصل جناح کا سراغ ملے گا۔ وہ جناح جو بظاہر انگریزی بولتا، مغربی لباس پہنتا اور مغربی طور طریقوں پر عمل کرتا تھا، لیکن بالٹی طور پر کیا تھا۔ قائدِ اعظم کے الفاظ تھے:

”مسلمانوں! میں نے دنیا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ دولت، شہرت اور عیش و عشرت کے بہت اطف اٹھائے۔ اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد اور سر بلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مردوں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مردوں کے میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی۔ میں آپ کی داد اور شہادت کا طلب گارنہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنادل، ایمان اور میرا ضمیر گواہی دے کہ جناح تم نے مدافعت اسلام کا حق ادا کر دیا۔ جناح تم مسلمانوں کی حمایت کا فرض بجالائے۔ میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتون کے غلبے میں علم اسلام کو سر بلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔“ غور کیجئے کہ جب قائدِ اعظم نے یہ تقریر کی اس وقت ان کی عمر تقریباً 53 سال تھی اور ان کی شہرت اونچ رہیا پڑھی۔ قائدِ اعظم کو زندگی بھرا قلیتوں کے مسئلے سے واسطہ رہا اور وہ اس سے منٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ مخدود ہندوستان میں مسلمان سب سے بڑی اقلیت تھے اور اس اقلیت کے سب بڑے رہنماء معلمی جناح تھے۔ چنانچہ مخدود ہندوستان کا خواب ٹوٹنے کے بعد جس کا نقطہ عروج 1928ء کی نہر و پورٹ کو قرار دیا جا سکتا ہے کیوں کہ قائدِ اعظم نے اسے پارٹنگ آف دی ویز یعنی راستوں کی علیحدگی قرار دیا تھا۔ قائدِ اعظم پہلے پہل مسلمان اقلیت کے حقوق اور بعد ازاں مسلمان قوم کے حقوق کے لئے اس وقت تک مسلسل لڑتے رہے، جدوجہد کرتے رہے جب تک قیام پاکستان کے امکانات واضح

14-15 اگست کی نصف شب جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو یہ قدر کی مبارک رات تھی۔ جسے ہم لیلۃ القدر کہتے ہیں۔ 15 اگست 1947ء کو جب پاکستانی قوم نے اپنا پہلا یوم آزادی منایا تو اس روز ستائیسوسیں رمضان اور جمعیۃ الوداع کا دن تھا۔ گویا ساری نیک سعیتیں اس روز یکجا ہوئی تھیں۔ آپ نے سورۃ القدر میں پڑھا ہوا کہ لیلۃ القدر کے موقع پر فرشتے آسمانوں سے اتر آتے ہیں اور مطلع فریتک سلام بھیجتے ہیں۔ اللہ سبحانہ، تعالیٰ بھی نچلے عرش پر تشریف فرماتے ہیں۔ اسی مبارک رات جب آسمان سے اللہ پاک کی بے انہا، ان گنت اور بے شمار نعمتوں بر سر ہی تھیں تورات کے بارہ بجے، قیام پاکستان کا اعلان ہوا تھا۔ بے شک قیام پاکستان اللہ پاک کی عطا تھی اور پاکستانی قوم کے لئے لا تعداد نعمتوں میں سے ایک نعمت تھی۔ جمہوری نظام پاریماني جمہوری نظام برطانوی حکمرانوں نے ہندوستان میں متعارف کرایا تھا۔ عوام کی کسی حد تک سیاسی تربیت بھی ہو چکی تھی لیکن پاکستانی جمہوریت کی بنیاد اسلامی اصولوں پر جب کہ ہندوستانی جمہوریت کی بنیاد سیکولر اصولوں پر رکھی جانی تھی۔ یعنی پاکستان کو ایک اسلامی جمہوری ریاست جب کہ ہندوستان کو سیکولر ریاست بنانا تھا۔ افسوس کہ پاکستان صحیح معنوں میں نہ اسلامی ریاست بن سکا اور نہ ہی جمہوری ریاست۔ اسی صورت حال کا نتیجہ 1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور پاکستان کے دونوں کی صورت میں نکلا۔ یاد رکھیں اگر پاکستان اپنی روح کے مطابق صحیح معنوں میں اسلامی جمہوری ریاست ہوتا تو ایک صوبے کی علیحدگی کی بھی نوبت ہی نہ آتی۔ اگست کے حوالے سے اہم ترین سوال یہ ہے کہ پاکستان کا تصور کیا تھا؟ قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح نے کس قسم کا تصور پاکستان قوم کے سامنے پیش کیا؟ ان کے ذہن میں پاکستان کے نظام کا نقشہ کیا تھا؟ انھوں نے کس تصور پاکستان کے لئے عوام سے ووٹ لے کرنے صرف انگریزوں کو تقسیم پر مجبور کر دیا بلکہ مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت پر بھی مہر تصدیق ثبت کر دی تھی؟ 46-1945 کے انتخابات میں مسلم لیگ کی فقید المثال کامیابی کے بعد خود کا نگرس کے لئے ”تقسیم“ کے علاوہ کوئی چارہ یا آپشن باقی نہ بچا تھا۔ اس پس منظر میں یہ حقیقت ہمیشہ ہمارے ذہنوں میں رہنی چاہئے کہ اول تو قیام پاکستان ایک جمہوری و سیاسی عمل کا ”پھل“ یا منطقی انجام تھا اور دوم یہ کہ مطالبه پاکستان کے مقدار کا فیصلہ خود ہندوستان کے مسلمانوں نے 46-1945 کے انتخابات میں مسلم لیگ کو 75 فی صد ووٹ دے کر کیا تھا۔ انگریزوں نے آخری لمحے تک کوشش کی کہ ہندوستان متحد رہے، انھوں نے پورے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا اور وہ پورا ہندوستان ہی کا نگرس کو لوٹا دینا چاہتے تھے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ قدرت کا فیصلہ تھا کہ ہندوستان تقسیم ہو اور قدر کی مبارک رات کو آسمانوں سے برستی رحمتوں کے درمیان پاکستان قائم ہو۔ اگست کے حوالے سے اہم ترین سوال یہ ہے کہ وہ تصور پاکستان کیا تھا جس کے لئے عوام نے

ذمہ داری ڈال دی گئی ہے۔ حکومت کا پہلا فرض امن عامہ قائم کرنا ہے تاکہ شہریوں کی جائیداد اور مذہبی اعتقادات کی حفاظت کی جاسکے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ رشوت اور کرپشن ہے۔ اس اسمبلی کو اس زہر کے خاتمے کے لئے موثر اقدامات کرنے ہیں۔ ایک اور لعنت بیک مارکینگ یعنی چور بازاری ہے جس کا تدریک آپ کو کرنا ہے۔ اسی طرح ہمیں اقراب پروری اور ظلم و زیادتی کو بھی کچانہ ہے۔ مجھے علم ہے کہ کچھ لوگوں نے بگال اور پنجاب کی تقسیم کو تسلیم نہیں کیا۔ میرے نزدیک اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا کرنا ہے؟

اگر ہم پاکستان کو خوشحال اور عظیم ریاست بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں ہمه وقت عوام کی خوشحالی اور بہتری پر توجہ دینا ہوگی۔ اگر آپ ماضی کی تلخیوں کو فن کر کے، رنگ و نسل اور عقیدے کے اختلافات کو پس پشت ڈال کر، تعاون اور برابری کی فضایں کام کریں گے تو آپ کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ اگر ہم اس جذبے کے ساتھ کام کریں تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکثریت اور اقلیت، مسلمان اور ہندو کے درمیان تضادات ختم ہو جائیں گے کیونکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں بھی پٹھان، پنجابی، شیعہ، سنی وغیرہ ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں برہمن، وشا، ویش، کھتری، بہگالی و مدراسی ہیں۔ یہی تقسیم ہندوستان کی آزادی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ رہی ہے۔ ہمیں اس سے سبق سیکھنا چاہیے۔ ”آپ آزاد ہیں مندرجہ میں پوچھ کریں یا مسجد میں عبادت کریں۔

آپ کا کسی مذہب، ذات یا عقیدے سے تعلق ہے اس سے حکومت کو سروکار نہیں۔ کسی زمانے میں انگلستان کے حالات نہایت خراب تھے۔ اور اب وہاں رومان کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کے درمیان اختلافات ختم ہو چکے ہیں اور وہ اپنے ملک کے یکساں شہری ہیں۔ اگر آپ بھی اپنے سامنے یہی آئینہ میں رکھیں تو وقت گزرنے کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق مٹ جائے گا۔ مذہب کے حوالے سے نہیں کیونکہ ہر شخص کا اپنا مذہب ہوتا ہے بلکہ سیاسی حوالے سے کیونکہ سبھی ایک ریاست کے شہری ہوں گے۔“

11 اگست کی تقریر کے حوالے سے یہ جاننا ضروری ہے کہ قائدِ عظم نے یہ تقریر فی البدیہ کی تھی۔ اسے ضبط تحریر میں لا یا گیا تھا اور نہ ہی اس کے لئے تیاری کی گئی تھی۔ خود قائدِ عظم نے اپنی تقریر میں کہا کہ ”میں فی الحال کوئی سوچ سمجھا بیان نہیں دے سکتا۔ میں چند ایک ایسی باتیں کہوں گا جو میرے ذہن میں آئیں گی۔“ اس سے ظاہر ہے یہ کوئی پالیسی بیان نہیں تھا، ہی غور و خوض کے بعد لکھی ہوئی کوئی تقریر تھی۔ اس تقریر کا بنیادی نقطہ تمام شہریوں کے لئے مساوی حقوق تھے، جس پر اس سے قبل قائدِ عظم متعدد بار روشنی ڈال چکے تھے۔ وہ وقتاً فوقاً اقلیتوں کے مساوی حقوق کے ضمن میں بیشاق مدینہ کی مثال دیتے رہے تھے اور وہ اس سلسلے میں ہمیشہ بیشاق مدینہ سے ہی رہنمائی اور فکری روشنی حاصل کرتے تھے۔ بقول پروفیسر شریف الحباد مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے برابر حقوق کے ضمن میں ان کے سامنے ایک مبارک مثال موجود تھی کیونکہ بیشاق مدینہ (622-23ء) میں، جسے دنیا کے پہلے تحریری آئین کی حیثیت حاصل ہے، ڈاکٹر حمید اللہ کے بقول تمام شہریوں کو ان کے مذہب سے قطع نظر برابر کے حقوق دیئے گئے تھے۔ موجودہ دور میں مذہب سے بالاتر ہو کر سب شہریوں کو برابری کا درجہ دینا ایک سیکولر

نہیں ہو گئے۔ مسلمان اقلیت سے مسلمان قوم کے سفر میں 1940ء کی قرارداد لا ہور یا قرارداد پاکستان ایک طرح سے اہم ترین سنگ میں کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے بعد قائدِ عظم کا موقف یہ رہا کہ مسلمان ایک اقلیت نہیں بلکہ ہر تعریف، معیار اور تصور کے مطابق ایک قوم ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قومیت کی اہم ترین بنیاد مذہب تھی۔ اسی طرح جب قیام پاکستان کا مرحلہ قریب آیا تو قائدِ عظم کے لئے سب سے اہم سوال اور مسئلہ پھر اقلیتوں کا تھا۔ کیونکہ پاکستان میں بھی کئی مذہبی اقلیتیں آباد تھیں اور ادھر ہندوستان میں بھی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں ہی کی تھی جس کے تحفظ کے لئے قائدِ عظم پر بیشان رہتے تھے۔ چنانچہ قیام پاکستان سے چند ماہ قبل اور چند ماہ بعد تک ان سے بارہا اقلیتوں کے مستقبل کے بارے میں سوالات پوچھے جاتے رہے جس کی وہ بار بار وضاحت کرتے رہے۔ اس دور میں قائدِ عظم نے جو تقاریر کیں یا بیانات دیئے ان کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ اس مسئلے کے تناظر میں کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں قائدِ عظم کے ذہن اور فکر کو سمجھنے کے لئے ان کی اس پریس کا لافرنس کا حوالہ دینا ضروری ہے جو انہوں نے پاکستان کا گورنر جنرل نامزد ہونے کے بعد 14 جولائی 1947ء کو نئی دہلی میں کی۔ اقلیتوں کے ضمن میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا..... میں اب تک بار بار جو کچھ کہتا رہا ہوں اس پر قائم ہوں۔ ہر اقلیت کو تحفظ دیا جائے گا۔ ان کی مذہبی رسومات میں خل نہیں دیا جائے گا اور ان کے مذہب، اعتقاد، جان و مال اور کلچر کی پوری حفاظت کی جائے گی۔ وہ ہر لحاظ سے پاکستان کے برابر کے شہری ہوں گے۔“

قائدِ عظم نے مزید کہا، ”آپ مجھ سے ایک فضول سوال پوچھ رہے ہیں۔ گویا میں اب تک جو کچھ کہتا رہا ہوں وہ رائیگاں گیا ہے۔ آپ جب جمہوریت کی بات کرتے ہیں تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ ہم نے جمہوریت 1300 سال قبل سیکھ لی تھی۔“

قائدِ عظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر ہے جو انہوں نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا صدر منتخب ہونے پر اسمبلی میں کی۔ یہی وہ تقریر ہے جس کی توضیح یا تشریع کر کے کچھ حضرات یہ مفہوم نکالتے ہیں کہ قائدِ عظم پاکستان کے لئے سیکولر جمہوری نظام چاہتے تھے۔ جبکہ دوسرا مکتبہ فکر اس توضیح سے اس بنیاد پر اختلاف کرتا ہے کہ اول تو قائدِ عظم کی تقریر سے ہر گز یہ مفہوم نہیں نکلتا اور دوم یہ تاثر غیر منطقی ہے کیونکہ قائدِ عظم جیسے لیڈر کی ایک تقریر کو ان کی دوسری لاتعداً تقریروں یا بیانات سے، جو انہوں نے اس سے قبل یا بعد دیئے، الگ یا علیحدہ کر کے صحیح نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ سوال یہ ہے کہ قائدِ عظم نے 11 اگست کی تقریر میں کیا کہا جو اس قدر بحث و نزاع کا سبب بن گیا۔ دراصل انہوں نے اس تقریر میں ان بنیادی مسائل کی نشاندہی کی جو اس وقت پاکستان کو درپیش تھے اور ان کے ساتھ ساتھ بابائے قوم (فادر آف دی نیشن) ہونے کے ناطے کچھ نصیحتیں بھی کیں۔ اس تقریر کا مکمل اور اک حاصل کرنے کے لئے پوری تقریر کو اس کے سیاق و سبق اور پس منظر میں پڑھنا ضروری ہے۔ قائدِ عظم نے کہا کہ.....

”ہم آپ کی مدد سے اس اسمبلی کو مثالی بنا سکیں گے۔ اس اسمبلی نے بیک وقت دستور سازی اور قانون سازی کے فرائض سرانجام دینے ہیں جس کے سبب ہم پر نہیات اہم

اسلام کامل ضابط حیات ہے۔ سیرت النبی ہمارے لئے اعلیٰ نمونہ ہے، جمہوریت، مساوات اور انصاف ہم نے اسلام سے سیکھا ہے اور اسلام نے جمہوریت کی بنیاد 1300 برس قبل رکھ دی تھی۔ اس لئے ہمارے لئے یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ پاکستان میں اقلیتوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے اور یہ کہ ہمارے نبی کریمؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں سے جس فراغدی کا مظاہرہ کیا تھا ہم اس پر عمل کریں گے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے آئین کی بنیاد شریعت پر نہیں رکھی جائے گی وہ سازشی اور منافق ہیں اور آخر میں یہ کہہ کر تمام شکوک و شبہات کے تابوت میں آخری کیل ٹونک دی کہ پاکستان کا آئین جمہوری ہوگا اور اس کی بنیاد اسلامی اصولوں پر رکھی جائے گی۔ گویا جہاں تک نظام حکومت کا تعلق ہے قائدِ عظم کا تصور پاکستان پوری طرح واضح ہے اور وہ یہ کہ قائدِ عظم ایک ماذر ان جمہوری پاکستان چاہتے تھے اور اگر وہ زندہ ہوتے تو ہمارا آئین یقیناً انھیں بنیادوں پر تشكیل دیا جاتا۔ قائدِ عظم کی تقاریر کا مطالعہ کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کی داخلی صورتحال کے حوالے سے وہ صوبائیت کے مسئلے سے بہت پریشان تھے۔ پشاور سے لے کر ڈھاکہ، چٹا گانگ تک ہر جسمہ عام اور خطاب میں انھوں نے عوام کو صوبائیت کے بارے میں وارنگ دی اور نصیحت کی کہ وہ صوبائیت کے زہر کو نکال باہر پھیلنیں۔ ماضی پر رنگاہ ڈالیں تو بابائے قوم کے ویژن، بصیرت اور دوربینی کی داد دینی پڑتی ہے کہ بالآخر صوبائیت نے 1971ء میں پاکستان کو دولخت کر دیا اور آج بھی کئی دہائیوں کے بعد بھی پاکستان کو جو سب سے بڑا چیخ درپیش ہے وہ صوبائیت کا ہے۔ قائدِ عظم نے اپنی تقاریر میں سماجی انصاف اور مساوات پر بہت زور دیا جو ان کے تصور پاکستان کا نگزیر حصہ ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں سماجی اور معاشی انصاف ہو، تمام شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں، پاکستانی معاشرہ رشوت خوری، بلیک مارکینگ، اقرباً پروری، فرقہ واریت سے بالکل پاک ہو۔ وہ فیوڈل ازم اور جا گیرداری نظام کا خاتمه چاہتے تھے۔ اس حوالے سے انھوں نے کئی موقع پر واضح کیا کہ وہ جا گیرداروں اور ووڈیروں کے لئے نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے لئے پاکستان حاصل کر رہے ہیں۔ وہ فوج اور بیوروکریسی کو بہر حال سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے اور کبھی یہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے کہ پاکستان میں فوج حاکم ہوگی یا بیوروکریسی سیاست میں ملوث ہوگی، لیکن ہماری بدقسمتی کہ قائدِ عظم پاکستان بننے کے تقریباً ایک برس بعد انتقال کر گئے اور ان کے جانشین قائدِ عظم کے خواب کو شرمende تعبیر نہ کر سکے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بااثر زمیندار، وڈیرے اور رسول و ملکی بیوروکریسی اقتدار پر قابض ہو گئی۔ نتیجے کے طور پر غریب عوام جن کے لئے قائدِ عظم نے پاکستان حاصل کیا تھا ظالم و ستم، بے انصافی، غربت اور محرومی کی چکلی میں پس رہے ہیں۔ ان پر مایوسی اور بے حسی کی کیفیت طاری ہے اور انھیں دور در تک اس گلہ جوڑ کے شکنج سے رہائی کی صورت نظر نہیں آتی۔ اگرچہ ہم قائدِ عظم کے تصور پاکستان سے بہت دور ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قوم کے ذہن میں قائدِ عظم کے ویژن کوتازہ رکھنا ضروری ہے تاکہ ہمیں یہ احساس رہے کہ ہماری قومی منزل کیا ہے اور ہمیں اسے بہر حال ایک دن حاصل کرنا ہے۔ منزل دور سہی، منزل کا شعور اور احساس تو زندہ ہے۔

اصول سمجھا جاتا ہے لیکن آج سے طویل عرصہ قبل حضور نبی کریم ﷺ نے اسے میثاق مدینہ کا حصہ بنا کر اسلامی اقدار کا جزو بنادیا تھا۔ قائدِ عظم نے ہمیشہ تھیو کریمؐ کی مخالفت کی کیونکہ اسلام میں تھیو کریمؐ کا تصور موجود نہیں۔ علامہ اقبال تو جمہوریت کو اسلامی اصولوں اور فریم ورک کے قریب پاتے ہیں اور اجتہاد کا اختیار بھی منتخب نمائندوں یعنی پارلیمنٹ کے سپرد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قائدِ عظم پاکستان کو ایک ماذر ان اسلامی جمہوری ملک بنانا چاہتے تھے اور ان کے نزدیک اسلامی اور جمہوری اصولوں میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ قائدِ عظم کی تقاریر کا مطالعہ کریں تو یہ راز کھلتا ہے کہ قائدِ عظم نے اپنی تقریروں میں کبھی بھی لفظ سیکولر ایزم استعمال نہیں کیا جبکہ اسلام ان کی تقریروں اور تحریروں کا محور نظر آتا ہے۔ اس تقریر کا بنظر غائزہ مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا نفس مضمون اور مدعای اقلیتوں کو احساس تحفظ اور بحیثیت شہری بربری کا پیغام دینا تھا اور قوم کو اتحاد کی تلقین کرنا تھا جس میں پاکستان کی ترقی کا راز مضمرا ہے کیونکہ ہندوستان میں یہ پروپیگنڈہ جاری تھا کہ پاکستان ایک مذہبی ریاست ہو گی جہاں اقلیتوں کو غلام بنا کر رکھا جائے گا۔ اس تقریر میں قائدِ عظم نے رہمنی کی تھیوک اور پروٹیسٹنٹ فرقوں کا ذکر کیا جو کہ عیسائیت کے دو فرقے ہیں۔ وہ اسلام اور ہندو مت کی مانند و مختلف مذاہب نہیں۔ اس تقریر سے قبل اور بعد ازاں بھی قائدِ عظم اقلیتوں کو یقین دہنیاں کرتے رہے اور بار بار یہ کہتے رہے کہ رواداری (Tolerance) اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ چنانچہ قائدِ عظم نے 14 اگست 1947ء کو دستور ساز اسمبلی کے افتتاح کے موقع پر ماونٹ بیٹن کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے بھی اپنے اسی نقطہ نظر کو دہرا یا۔ ماونٹ بیٹن نے اقلیتوں کے حوالہ سے مغل بادشاہ اکبر کی فراغ دلی کا ذکر کیا تھا جس کے جواب میں قائدِ عظم نے کہا کہ، ”اکبر بادشاہ نے جس فراغ دلی کا مظاہرہ کیا وہ ہمارے لئے کوئی نی بات نہیں۔ اس کا آغاز 1300 برس پہلے ہو گیا تھا جب ہمارے نبی کریمؐ نے فتح کے بعد نہ صرف زبانی بلکہ عملی طور پر یہودیوں اور عیسائیوں سے فراغلانہ سلوک کیا اور ان کے عقائد کا احترام کیا۔ مسلمانوں کی تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔“ یہاں بھی انہوں نے میثاق مدینہ کا حوالہ دیا اور حضور نبی کریمؐ کو اپنا رہنمایا اور رول ماذل قرار دیا۔ قائدِ عظم کی تقاریر کو پڑھیں تو ان میں مسلسل ایک اسلامی جمہوری ریاست کا تصور ملتا ہے۔

نومبر 1945ء میں قائدِ عظم نے پشاور میں کہا.....

”آپ نے سپاسنا میں مجھ سے پوچھا ہے کہ پاکستان میں کون سا قانون ہو گا۔ مجھے آپ کے سوال پر سخت افسوس ہے۔ مسلمانوں کا ایک خدا، ایک رسول اور ایک کتاب ہے۔ یہی مسلمانوں کا قانون ہے اور بس۔ پاکستان کا قانون اسلام کی بنیاد ہو گا اور پاکستان میں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں ہو گا۔“

14 فروری 1947 کو شاہی درباری بلوجتھان میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ”میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات اس اسوہ حسنہ پر چلنے میں ہے جو ہمیں قانون عطا کرنے والے پیغمبر اسلام ﷺ نے دیا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی جمہوریت کی بنیاد صحیح معنوں میں اسلامی تصورات اور اصولوں پر رکھیں۔“ قائدِ عظم مسلسل یہ کہتے رہے کہ

و سع ت الل دخ ان کا کالم بات سے بات: من در نہیں بنے گا!



تحریر: و سع ت الل دخ ان تجزیہ کار

گا۔ آئین میں اقلیتوں کو برابر کے حقوق اور مذہبی عبادت کے حق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔ آئین میں کہیں نہیں کہا گیا کہ برابر کے شہری ہونے کے باوجود وہ کوئی نئی عبادت گاہ تعمیر نہیں کر سکتے یا لیکس دینے کے باوجود ریاست سے عبادت گاہوں کی تعمیر و مرمت کے لیے گرانٹ نہیں لے سکتے۔ جس طرح پاکستان میں مسلمان شہریوں کی آبادی بڑھ رہی ہے اور اس بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کے اعتبار سے نئی مساجد اور قبرستانوں کی تعمیر ہو رہی ہے اسی طرح غیر مسلموں کی آبادی بھی بڑھ رہی ہے مگر ان کی عبادت گاہوں یا آخری رسومات کی سہولتوں میں اضافہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ مثلاً آل پاکستان ہندو رامپل مس مومنٹ کے سروے کے مطابق تقسیم کے وقت موجودہ پاکستان کی آبادی ساڑھے تین کروڑ تھی جبکہ 428 مندر آباد تھے۔

73 برس کے دوران 20 کو چھوڑ کے باقی تمام مندر گوداموں، گھروں، دفاتر، تعلیم گاہوں وغیرہ میں غائب ہو گئے۔ ملک میں اس وقت ہندو آبادی 40 لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ اس 40 لاکھ کے لیے سندھ میں 11، پنجاب میں چار، بلوچستان میں تین اور خیبر پختونخوا میں دو مندر فعال ہیں۔ ہندو کمیونٹی سینٹر زعنقا ہیں جبکہ شمشان گھاث کی سہولتیں سینکڑوں میل کے فاصلے پر ہیں۔ حکومت نے چار ماہ پہلے اعلان کیا کہ لگ بھگ چار سو مندوں کو دوبارہ بحال کر کے ہندو برادری کے حوالے کیا جائے گا مگر رفتار کا عالم یہ ہے کہ 73 برس میں صرف چار مندر بحال ہو سکے۔ چکوال میں کٹاس راج (یہ عبادت سے زیادہ نمائشی مقاصد کے لیے ہے)۔ سیالکوٹ، پشاور اور ژوب میں ایک ایک مندر بحال ہو پایا۔ یہی رفتار ہی تو باقی 396 مندر زیادہ سے زیادہ اگلے ایک ہزار برس میں بحال ہو جائیں گے۔ سعودی عرب اور ایران دو مسلمان ممالک ہیں جہاں قانوناً کوئی نئی غیر مسلم عبادت گاہ تعمیر نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ کسی اور ملک میں قانوناً اس کی مناہی نہیں البتہ شرعی تشریعات الگ الگ ہیں۔ جیسے خلیجی ممالک میں عبادت گاہوں کی تعمیر کو آبادی کے تناسب اور مذہبی سہولت سے جوڑ کے دیکھنے کا چلن ہے۔ چنانچہ اومان میں سو اسال پر انا شیو مندر مقطط میں قائم ہے۔ بھرین میں ہندو کارکنوں کے لیے آٹھ مندر ہیں جنہیں سرکاری و بین الاقوامی سرپرستی حاصل ہے۔ دئی میں سنہ 1958 میں

حالانکہ اسلام آباد ہائی کورٹ نے پاکستان کے دارالحکومت میں تین ہزار ہندو شہریوں کی سہولت کے لیے پہلے مندر کمپلیکس کی تعمیر و رونے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ حکومت نے اس منصوبے کے لیے دس کروڑ روپے کی امانت کا بھی اعلان کیا۔ مگر اسلام آباد کے انتظامی ادارے کمپلیکل ڈولپمنٹ اتھارٹی (سی ڈی اے) نے اس مندر کے لیے مختص اراضی کے گرد احتیاطی چار دیواری کی تعمیر کیہے کہ رکاوادی کے تعمیراتی نقشے کی منظوری تک کسی بھی اراضی پر کوئی تعمیراتی سرگرمی قانوناً نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہندو پنجائیت نے اجازت ملنے تک چار دیواری کی تعمیر و رونک دی ہے۔ تعمیراتی قوانین کے نفاذ میں سی ڈی اے کی سنبھیگی قابل قدر ہے۔ سنہ 2015 میں وزارت داخلہ کے سروے سے معلوم ہوا کہ سی ڈی اے کی حدود میں 492 مساجد آباد ہیں مگر ان میں سے 233 یعنی 47 فیصد مساجد قبضے کی زمین پر بغیر کسی قانونی منظوری کے قائم ہیں اور کئی مساجد کے ساتھ بلا اجازت مدارس بھی متصل ہیں۔ کیا سی ڈی اے میں اتنا دم ہے کہ وہ ان مساجد و مدارس کی ایک ایزٹ بھی ہلا سکے؟ کیا کوئی عالم حق بانگِ دہل آج کل کے ماحول میں سکتا ہے کہ قبضے کی زمین پر نماز نہیں ہو سکتی۔ مسجد نبوی کی زمین کے مالک دوستیم پھوٹے نے اسے تحفٹا پیش بھی کر دیا مگر پیغمبر اسلام نے اس قطعے اراضی کو قیتا حاصل کیا تاکہ آنے والے ادوار کے لیے مثال قائم ہو۔ اسلام آباد میں مکتبہ دیوبند کے علماء کرام نے گذشتہ بفتہ پریس کانفرنس کی کہ اسلامی مملکت میں بت خانے کی تعمیر غیر شرعی ہے اور صرف پرانے مندوں کی بحالی تو سعی ہو سکتی ہے۔ البتہ ایک عالم مفتی راغب نجیی نے کہا کہ مندر کی تعمیر میں سرکاری پیسے استعمال نہیں ہو سکتا تا ہم ہندو برادری اپنے سرمائے سے قطعہ اراضی خرید کے مندر تعمیر کر سکتی ہے۔ اب یہ معاملہ حکومت نے اسلامی انجیریاتی کونسل کو بھجوادیا ہے۔ اس دوران پنجاب اسیبلی کے پیکر چوہدری پرویز الہی بھی بحث میں کوڈ گئے اور انھوں نے دو ہاتھ مزید آگے بڑھ کے کہا کہ اسلامی ملک کے دارالحکومت میں مندر کی تعمیر ریاست مدنی کی روح کے خلاف ہے۔ صرف پرانے مندر بحال ہو سکتے ہیں۔ اس پوری بحث میں کسی نہیں کہا کہ ہمیں اس بارے میں اسلام آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کا احترام کرنا چاہیے ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ آئین کی روشنی میں ہی دیا گیا ہو

جاتا تھا، جنوا فرانسیسی شہر نیم کے قریب تھا، جنوا اطالوی شہر ہے جبکہ نیم فرانسیسی، دونوں قریب قریب واقع ہیں، نیم شہر ڈی نیم کہلاتا ہے، ڈی نیم میں ہزاروں کھڈیاں تھیں، ان کھڈیوں پر موٹا سوتی کپڑا بُنا جاتا تھا۔ یہ کپڑا سرج کہلاتا تھا، سرج کپڑا بن کر جنوا پہنچتا تھا، جنوا کے انگریز اس کپڑے پر لا ہور کا نیل چڑھاتے تھے، کپڑا نیلا ہو جاتا تھا، وہ نیلا کپڑا بعد ازاں درزیوں کے پاس پہنچتا تھا، درزی اس سے مزدوروں، مستریوں اور فیکٹری ورکرز کے لیے پتوں میں سیتے تھے، وہ پتوں بعد ازاں جنوا شہر کی وجہ سے جیز کہلانے لگیں، جیز پتوں میں مشہور ہو گئیں تو ڈی نیم شہر کے تاجروں نے جوش حمد میں اپنے کپڑے کے کوڈی نیم کہنا شروع کر دیا، یہ ڈی نیم کپڑا آہستہ آہستہ ”ڈینم“ بن گیا، جیز اور ڈینم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اکٹھے ہوئے اور یہ ڈینم جیز بن گئے۔ جیز کے تین عناصر تھے، ڈی نیم کا کپڑا، لا ہور کا نیل اور جنوا کے درزی، مغلوں کے دور میں اگر لا ہور کا نیل نہ ہوتا تو شاید جیز نہ بنتی اور اگر بنتی بھی تو کم از کم یہ نیل نہ ہوتی، جیز کا نیلا پن بہر حال لا ہور کی مہربانی تھا، آپ آج بھی انگریزی کی پرانی ڈکشنریاں نکال کر دیکھ لیں، آپ کوان ڈکشنریوں میں نیل کا نام لا ہوری ملے گا، گورے اس زمانے میں نیل کو لا ہوری کہتے تھے، یہ رنگ بعد ازاں انڈیا کی مناسبت سے انڈیگو بن گیا۔

ماہنامہ انٹرنیشنل
فرانسیسی، اطالوی، پرتگالی اور ڈچ نیل کے لئے ہندوستان آتے تھے جب کہ برطانوی افیون کے لئے یہاں آئے اور پھر پورا ہندوستان ہتھیالیا، لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں، ہم ابھی اس دور کی بات کر رہے ہیں جب نیل لا ہور کی سب سے بڑی تجارت تھا اور یہ لا ہوری اور انڈیگو کہلاتا تھا۔ یہ ہزاروں میل کا زمین اور سمندری فاصلہ طے کر کے جنوا پہنچتا تھا، جیز کا حصہ بتتا تھا اور پوری دنیا میں پھیل جاتا تھا لیکن پھر لا ہور کے لا ہوری نیل کو نظر لگ گئی۔ مغلوں نے نیل پر ٹیکس لگادیا، یورپ نے مصنوعی رنگ ایجاد کر لئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے فرانسیسیوں، اطالویوں اور پرتگالیوں کو مار بھگایا اور یوں نیل کی صنعت زوال پذیر ہو گئی۔

نیل لا ہوری نہ رہا مگر لا ہور کے شہری آج بھی رنگ باز ہیں، لا ہوریوں کو یہ خطاب ممبئی اور کولکتہ کے تاجروں نے دیا تھا، ہندوستان میں اس وقت فارسی زبان رائج تھی، فارسی میں کسی بھی پیشے سے وابستہ لوگوں کو باز کہا جاتا تھا ہے مثلاً پتنگ بنانے والے پتنگ باز اور کبوتر پالنے والوں کو کبوتر باز، اس مناسبت سے رنگ بینچے والے رنگ باز ہو گئے۔ چنانچہ کولکتہ اور ممبئی کے تاجروں نیل کی صنعت سے وابستہ لا ہوریوں کو ”رنگ باز“ کہنے لگے، اس زمانے میں کیونکہ لا ہور کی زیادہ تر آبادی نیل کی صنعت سے وابستہ تھی چنانچہ پورا لا ہور رنگ باز ہو گیا، یہ رنگ بازی آج بھی لا ہوری مزاج میں زندہ ہے۔” منقول“



ایک کمرش عمارت کی چھت پر مندرجہ قائم تھا۔ ابھی دو برس پہلے متحده عرب امارات کی حکومت نے ابوظہبی میں 127 ایکڑ رقبہ سوامی نارائن مندر کی تعمیر کے لیے عطا کیا۔ اس وقت امارات میں تیس لاکھ کے لگ بھگ ہندوکارکن ہیں اور نیا مندر کمپلیکس ہندوآبادی کے تناسب سے بنایا جا رہا ہے۔ موقع ہے کہ اس سال کے اختتام تک یہ مندرجہ عبادت و سماجی سرگرمیوں کے لیے کھول دیا جائے گا۔ پہلے بڑے مسلمان ملک انڈونیشیا کے جزیرے جاوا میں نویں صدی کا پرہننا مندرجہ مشرقی ایشیا کا سب سے بڑا مندر اور عالمی وراثت کی یونیکو فہرست کا حصہ ہے۔ سرکار نے تمام قدیم مندو روں کو محفوظ اور پرکشش بنانے کے لیے خطرہ قم مختص کی چنانچہ مذہبی سیاحت میں پہچھے ایک عشرے میں دو گناہ اضافہ ہوا۔ دوسرا بڑے مسلمان ملک بُنگلہ دیش کے دارالحکومت کے ڈھائیش واری مندر کو مسجد بیت المکرم کی طرح قومی عبادت گاہ کا درجہ حاصل ہے۔ وہاں ہر صبح کا آغاز قومی پرچم لہرانے اور ترانے سے ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ سنہ 1988 میں اسلام ریاست کا قومی مذہب قرار دیا گیا۔ جبکہ تیرسے بڑے مسلمان ملک پاکستان میں یہ بحث ہو رہی ہے کہ ہندو شہریوں کے لیے نیا مندر جائز ہے کہ ناجائز۔ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی ملک ہے جہاں 60 کے عشرے تک جو 22 سرکاری چھٹیاں ہوتی تھیں ان میں 25 تا 31 دسمبر کرسمس کی ایک ہفتے کی چھٹیوں کے علاوہ ایسٹر، بیساکھی، دہمن، دیوالی اور ہولی کو بھی قومی تعطیل کا درجہ حاصل تھا۔ ریاست اس دور میں بھی تھی، حکمران اس دور میں بھی تھے اور علماء کرام تب بھی تھے۔ پھر شاید یوں ہوا کہ ذہنی قدچھوٹے ہونے لگے اور سائے لمبے۔۔۔ ارے یاد آیا، آج پانچ جولائی بھی تو ہے۔



رنگ باز لا ہوری

اکبر اور شاه جہاں کے دور میں لا ہور نیل کی دنیا کی سب سے بڑی منڈی ہوتا تھا۔ شہنشاہ اکبر نے لا ہور کے قلعے سے ذرا فاصلے پر ہندوستان میں نیل کی پہلی باقاعدہ منڈی قائم کی، یہ منڈی اکبر کے نام پر اکبری منڈی کہلاتی اور اس سے ملختی علاقہ رنگ محل، لا ہور کے مضائقی علاقے موجودہ ساہیوال میں میلوں تک نیل کے پودے تھے اسی نسبت سے اسے آج بھی نیلی بار کہتے ہیں، لوگ ان پودوں کا سست نکالتے تھے، سست کو بڑی کڑا ہیوں میں ڈال کر پکایا جاتا تھا، اس کا پاؤ ڈرا اور ڈلیاں بنائی جاتی تھیں، یہ ڈلیاں ٹوکریوں اور بوریوں میں بند ہو کر اکبری منڈی پہنچتی تھیں، تاجروں کے ہاتھوں بکتی تھیں، گذوں کے ذریعے ممبئی (پرانا نام ممبئی) اور کولکتہ (پرانا نام کلکتہ) پہنچتی تھیں، وہاں سے انھیں فرانسیسی اور اطالوی تاجر خریدتے تھے، جہازوں میں بھرتے تھے، یہ نیل بعد ازاں اٹلی کے ساحلی شہر جنوا (Genoa) (یہ شہر جنیوانیں ہے) پہنچ



بلوچ تاریخ کی خالی جگہیں اور مغایطے

تحریر: آغا نیاز مسی



کارکردگی کی بہت تعریف کی 2 پھلفلش کی تاریخی اہمیت کا ذکر کیا 8 اخبارات کا حوالہ دیا مولانا ظفر علی خان کے بھرپور تعاون کا اور ان کے اخبارات کا تذکرہ بھی کیا گمراہ ہوں گے۔ بلوچ اور بلوچستان کے ان ہیروز کا نام لکھنا مناسب نہیں سمجھا جنہوں نے اپنی آسائشوں سے بھری زندگی کو بلوچ قوم اور بلوچستان کی سرزی میں کی اگریز سامرائج اور ان کے گماشتوں سے آزادی کی خاطر وقف کر دی جیل اور در بدری کوینے سے لگایا ہے کہ گھر بارستے بے گھر ہو گئے لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان ہیروز کا نام لکھنا گوارا نہیں کیا اور یہ جگہیں خالی چھوڑ کر غلط فہمیوں اور مغالطوں کا دروازہ کھول دیا اور نئی نسل کو اپنے ہیروز سے لاعلم رکھنے کی بنیاد ڈال دی تاکہ وہ اپنے حقیقی ہیروز کے ناموں اور کارنا موں سے لاعلم رہ کر بلوچ تاریخ کی ان خالی جگہیں کو پُر کرنے کے لیے غلط فہمیوں اور مغالطوں کا شکار ہوتے رہیں۔ ویسے بلوچستان کے تمام باشور افراد بخوبی جانتے ہیں کہ یہ کون لوگ تھے لیکن مستلزم نئی نسل کا ہے ان کو ان شخصیات سے کون روشناس کروائے گا۔ اس بارے میں عرض ہے کہ انہم اتحاد بلوچان کے بانی رہنماء اور اکیں میر



عبد العزیز کرد، بابو عبدالکریم شورش، میر گل خان نصیر، میرفضل محمد شہی، ملک عبدالرحیم خان خواجہ خیل، اور ملک فیض محمد یوسفی و دیگر تھے۔ جس طرح آل انڈیا مسلم لیگ والوں نے قائد اعظم کی مقبولیت اور کرشماقی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کو مسلم لیگ میں شمولیت اور قیادت سننگا لئے کی دعوت دی تھی بالکل اسی طرح انہم اتحاد بلوچان کی قیادت نے بھی جیل میں قید نوجوان بلوچ رہنماء نواب یوسف عزیز مسی سے خط و کتابت کے ذریعے انہم اتحاد بلوچان اور آل انڈیا بلوچ کانفرنس میں شمولیت اور قیادت سننگا لئے کی دعوت دے دی جنہوں نے قبول کر لی اور جیل سے رہا ہوتے ہی انہوں نے نہ صرف انہم اتحاد بلوچان اور آل انڈیا بلوچ کانفرنس کو منظم اور فعال کر دیا بلکہ کراچی سے اخبارات نکالنے کا عملی مظاہرہ بھی کیا جن کی معاونت میں بابو عبدالکریم شورش، میر گل خان نصیر، محمد حسین عفت اور سید ظہور شاہ ہاشمی و دیگر شامل تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے نواب یوسف عزیز مسی کی قائدانہ صلاحیتوں اور تاریخی جدوجہد اور کارنا موں سے متاثر ہو کر اپنے اخبارات ان کی سیاسی اور صحفی سرگرمیوں کے لیے مختص کر دیئے بلکہ مولانا ظفر علی خان نے یوسف عزیز مسی کی تعریف میں اشعار تک موزوں کیئے ان میں سے

عصر حاضر میں بلوچستان میں تحقیق، تنقید، تصنیف، تالیف اور ترجمے کے میدان میں ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب کا بہت بڑا نام، کام اور مقام ہے۔ وہ میرے پرانے مہربان ہیں اور نہایت قابل احترام بھی۔ ”بلوچ تاریخ خالی جگہیں اور مغایطے“ کے موضوع پر ان کا ایک مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے مضمون کا مقصد اپنے عنوان سے ہی واضح ہے کہ بلوچ تاریخ میں خالی جگہیں اور مغایطے بہت بیش اپنے انبہوں نے ایک مثال دی ہے کہ نمازیوں کے درمیان خالی جگہ کو شیطان بھرتا ہے اور ان کے بقول بلوچ تاریخ میں بھی بہت سی جگہیں خالی رہ گئی ہیں یا چھوڑ دی گئی ہیں جس سے مغایطے پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے جب یہ مضمون پڑھا تو مجھے پڑھ کر یہ حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے جس موضوع پر یہ مضمون لکھا ہے انہوں نے خود ہی اپنے موضوع اور مقصد کی نظر کرتے ہوئے بہت

سے مقامات پر خالی جگہیں چھوڑ دی ہیں جس سے یقینی طور پر غلط فہمیاں اور مغایطے پیدا ہونے کے دروازے (دشمنی، بغاوت) کیے گئے ہیں۔ انہوں نے ایک جگہ پر لکھا ہے کہ یہ گل بلوج نامی ایک پہلی زیر زمین سیاسی پارٹی 1920 میں بنی تھی اس کا دوسرا نام انہم اتحاد بلوچان تھا۔ اس

پارٹی نے پھر آگے چل کر آل انڈیا بلوچ کانفرنس کا نام دھار لیا۔ 1932-33 میں اس پارٹی کی چار چار روزہ سالانہ کانفرنس کی مثال پورے خطے کی سیاسی تاریخ میں موجود نہیں ہے اور یہ بھی تصور سے پرے کی بات ہے کہ یہ پارٹی آٹھ اخبارات چلاتی تھی۔ ہفت روزہ بلوچ کراچی 2 سال چلا اور بند کر دیا گیا، جہازی سائز والا ہفت روزہ بلوچستان جدید 5 ماہ تک پارٹی کا ترجمان بنارہا، بند ہوا تو سر روزہ ”ینگ بلوچستان“ کراچی سے جاری ہوا۔ اس کے 20 شمارے ہماری ترجمانی کرتے رہے۔ ایک اور سر روزہ ”نجات“ کراچی تھا جس کے 60 شمارے نکلے۔ ہفت روزہ بلوچستان بھی کراچی سے نکلتا تھا۔ جیکب آباد سے الحسنیف یہ کام کرتا رہا۔ مولانا ظفر علی خان کا زمیندار لا ہور تو سمجھو آں انڈیا بلوچ کانفرنس کا ہی اختصار تھا۔ انقلاب اور مساوات لا ہور بھی ہماری ترجمانی کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں بلوچ تاریخ کے 2 اہم ترین پھلفلش یا کتاب پچھے نہیں گردی اور فریاد بلوچستان چھپے تھے۔

یہاں پر قارئین پڑھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے کس فخر اور یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ اس خطے میں اس جیسی مثال نہیں ملتی انہم اتحاد بلوچان اور آل انڈیا بلوچ کانفرنس کی

ان کے 2 بہت مشہور اشعار یہ بھی ہیں

تم کو خفی عزیز ہے، ہم کو جلی عزیز
عارض کا گل تمہیں، ہمیں دل کی کلی عزیز

لقطہ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے
معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

ڈاکٹر شاہ محمد مری صاحب ہمارے لیئے بہت بڑے نام اور قابل احترام مگر اس کے باوجود ہم ان کو مولانا ظفر علی خان کی شخصیت سے موازنہ کے قابل نہیں سمجھتے انہی مولانا ظفر علی خان نے اپنے اخبارات تک یوسف عزیز مگسی کے لیے وقف کر دیئے اور ان کی مدح سرائی یا تعریف و توصیف بھی کی ہے مگر افسوس کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک تحقیقی مضمون یا کتاب میں یوسف عزیز مگسی اور ان کے دیگر ساتھیوں کا نام تک لینا گوارا نہیں کیا اس کے بر عکس انہوں نے مزدور تحریک کے حوالے سے صرف رابطہ کرنے کی بنیاد پر مصری خان کھتیر ان کا اور باکو کا فرنز یا کونیشیں میں شرکت کے حوالے سے تاریخی بلوچ کا ذکر کیا ہے۔ ان کا ذکر کرنا اچھی بات ہے مگر بلوچ اور بلوچستان کے حقیقی قائدین اور ہیروز کا ذکر نہ کرنا چاہیے دار؟ بات صرف یہاں تک نہیں ہے بلکہ انہوں نے 2 تاریخی پمفلٹس بعنوان "مس گردی اور فرید بلوچستان" کا ذکر تو کیا ہے لیکن وہ یہاں بھی ان تاریخی پمفلٹس لکھنے والے اور ان کی پاداش میں جیل کی سزا کھانے اور جرمانہ ادا کرنے والے بلوچ ہیر و نواب یوسف عزیز مگسی کا نام لینا گوارا نہیں کیا بلکہ انہوں نے یہاں بھی بلوچ تاریخ کے اہم موڑ اور کارنامہ کے مرکزی کردار کی جگہ خالی چھوڑ دی اور مغالطوں کا ایک بار پھر دروازہ کھوٹ دیا۔ حالانکہ بلوچ و بلوچستان اور پورے خطے کی تاریخ میں یوسف عزیز مگسی جیسی کمسن اور کرشناتی شخصیت کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی کہ وہ 20 سال کی عمر میں بیک وقت ایک مدرس، مفکر، سیاستدان، ادیب، صحافی، شاعر اور قبائلی سردار کے طور پر اپنے کارہائے نمایاں انجام دے کر صرف 27 سال کی عمر میں 31 مئی 1935 کے کوئٹہ کے ہولناک زلزلے میں شہید ہو کر ہمی دنیا تک بلوچ تاریخ میں ایک نہ مٹنے والا نام اور مقام بنا کر خالق حقیقی سے جا ملے۔

فقط یہیں ڈاکٹر صاحب نے مغالطوں کے لئے بلوچ تاریخ کے حوالے سے بہت سی اور جگہیں بھی پڑ کرنے کے لیے خالی چھوڑ دی ہیں مثال کے طور پر انہوں نے اسی مضمون میں ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ "اسی طرح یہ معلومات بھی تازہ ترین ہیں کہ بلوچستان ساڑھے 3 کروڑ سال قبل ایک سرسیز اور گھننا جنگل تھا اس پورے Wet era کو ابھی حالیہ برسوں میں دریافت کیا گیا فرانسیسی ماہر فاسلہ "زاں لوپ ولکم" نے اپنی ٹیم کے ساتھ بھی کے علاقے میں طویل کھدائی کی اور ان جنگلات میں "بلوچ تھیریم" نامی جانور فاسلہ دریافت کئے۔

اب قارئین خود میں الاقوامی سطح کی اس خبر کی اہمیت سمجھ سکتے ہیں اور یہ خبر جنہوں نے میڈیا میں وی ایں کا کردار اس حوالے سے کتنا اہمیت کا حامل ہے کہ ان کی وجہ سے ڈاکٹر

صاحب سمیت دنیا بھر کے کروڑوں افراد اس دریافت سے آگاہ ہوئے لیکن ڈاکٹر صاحب یہاں خبر دینے والوں کو بھی نظر انداز کر گئے۔ میں قارئین کو بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ ڈاٹائنار کے بلوج پر تحریم کی خبر 2006ء میں صرف میں نے ہی دی تھی جس کو پاکستان سمیت دنیا بھر کے میڈیا نے اس کی اہمیت کے پیش نظر خصوصی کو تجھے دی تھی اور یہ خبر مجھے اس وقت کے سیکرٹری لا یو اسٹاک بلوچستان اور علم و ادب دوست شخصیت ظفر اللہ بلوچ صاحب نے دی تھی چونکہ یہ خبر انتہائی اہمیت کی حامل تھی تو اس خبر میں، میں نے اپنا اور اپنے سورس ظفر اللہ بلوچ صاحب کا نام بھی دیا تھا کہ ہم بھی اس خبر کے حوالے سے تاریخی روایات کا حصہ بن جائیں میرے علاوہ یہ خبر کسی نہیں چلائی اس کی وجہ یہ ہے کہ فرانسیسی ٹیم خاموشی سے آئی اور خاموشی سے ہی چلی گئی تھی۔ نہ تو ڈیرہ بگٹی کی انتظامیہ نے یہ خبر چلائی تھی اور نہ ہی مکمل آثار تقدیمہ وغیرہ نے، یہ اعزاز صرف اور صرف ظفر اللہ بلوچ صاحب اور اس خاکسار کے حصے میں آیا مگر کیا کیجئے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے نام کی جگہ بھی خالی چھوڑ دی بقول ان کے خالی جگہ کو شیطان بھرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے اس لیئے بھی شکوہ نہیں کہ جب انہوں نے بلوچستان کے عظیم محسنوں کے نام لکھنا گوارا نہیں کیا تو میں اور ظفر اللہ بلوچ صاحب کس بااغ کی مولی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے 17 ویں عیسوی صدی میں بھی ایک تجربہ خیز خوالہ دے کر خالی جگہ چھوڑ دی ہے انہوں نے اسی مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے کہ 1666ء میں بلوچوں کے ایک قبیلے میں موت پر بھی ٹیکس عائد کر دیا گیا تھا اور وہ فی میت ایک چونی کی قم وصول کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہاں پر بھی یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کیا کہ وہ موت پر ٹیکس عائد کرنے والا کون سا قبیلہ تھا اور اس قبیلے کا سربراہ کون تھا؟ یہ جگہ بھی شیطان سے بھرنے کے لیے چھوڑ دی گئی۔ البتہ ہم ڈاکٹر صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ایک بہادر اور محب وطن بلوچ حکمران اور ولی قلات میر محارب خان کی انگروں کے مقابلے میں شہادت اور ان کے وزیر خزانہ دیوان بچل مل کی قربانیوں کا ذکر کیا کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ اس خالی جگہ کو بھرنے کے لیے اپناد مانگ کھپاتے رہتے کہ وہ کون لوگ تھے۔ اس لیئے میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ جب بلوچ تاریخ میں خالی جگہیں چھوڑ نے اور مغالطے کے حوالے سے شکوئے کر رہے ہیں اور پھر خود بھی وہی عمل دھرا رہے ہیں تو اس جو غلط فہمیاں اور مغالطے پیدا ہوتے رہیں گے تو ان کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے گی اور ایسی صورت میں عام قاری تو آنکھیں بند کر کے سب کچھ من و عن سچ تسلیم کر کے ان پر انہا اعتماد بھی کرے گا مگر جو لوگ تاریخ سے دلچسپی اور کچھ واقفیت رکھتے ہیں ان کے ذہنوں میں بہت سے سوالات جنم لیں گے اور ان سے شکوک و شبہات بھی جنم لیں گے اس لیئے ڈاکٹر صاحب سے دستہ بستہ گزارش ہے کہ وہ خود بھی تاریخ میں خالی جگہیں چھوڑنا بند کر دیں تاکہ شکوک و شبہات اور غلط فہمیاں اور مغالطے پیدا نہ ہو سکیں۔

اپنے بچوں کو پب جی گیم کھیلنے سے منع کریں

تحریر: عابد عمر جزل ناج بلوجستان



ٹینالوجی میں پے در پے تبدیلیوں نے ویڈیو گیمز کے ایسے درکھو لے ہیں۔ جہاں اور ترکیبیں سیکھ لیتے ہیں۔ یہ گیمز انکے ذہنوں میں تشدد، مار دھاڑ اور لڑنے جھگڑنے کے ایسے ہنر پیدا کر دیتے ہیں۔ جن سے وہ ویڈیو گیمز کے کھیلنے سے پہلے خالی الذہن ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ ایسا گیم ہے جس سے خوزیری اور جرام کو بڑھا وادیا جا رہا ہے۔ گیم کھیلنے والوں کو ایک ایک ہتھیار، بندوق، گن کا نام از بر ہو جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ اس گیم میں منتیات کا استعمال، تشدد، مار دھاڑ، چھپ چھپا کر قتل کرنا، گروہوں کے درمیان لڑائی، نازیبا اور عامیانہ الفاظ کا استعمال عام بات ہے۔ عام فرد کے لیے وہ تصورات اور الفاظ جن کو پہلے کبھی سوچنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب وہ ان گیمز کے ذریعے زندگی میں رپتے بنتے جا رہے ہیں۔ اور معاشرہ ان کے کثیر استعمال کے باعث انہیں قبول کر کے اپنے اندرضم بھی کر رہا ہے۔ تشدد، مار دھاڑ اور جنگ کے مناظر عام افراد خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی صحت پر کیا اثرات مرتب کریں گے۔ اس سے موبائل اور گیم کمپنیوں کو کوئی سروکار نہیں۔ موبائل گیم اور انٹرنیٹ لیکن یہ سوال معاشرے کے لیے بے حد اہم ہے۔ کہ پر تشدد اور اخلاق باختہ انٹرنیٹ کی تکلیف لاحق ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں موبائل پر انگلیوں کی مسلسل حرکت کی وجہ سے ابہام والی انگلی کو بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ ویڈیو گیمز کھیلتے ہوئے آنکھوں کی حرکت تیز ہو جانے کی وجہ سے آنکھوں پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ مقنایی لہریں موبائل اسکرین سے نکلتی رہتی ہیں جسکی وجہ سے آنکھ سرخ اور خشک ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ یہ گیم کھیلنے والوں میں خود اعتمادی کی کمی کے ساتھ نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتے ہیں۔ پب جی گیم میں ایسا ہے جس میں گروپ کی شکل میں دوسروں کو قتل کر کے انکی املاک تباہ کر کے ناحق انہیں زد و کوب کر کے لطف اٹھایا جاتا ہے۔ مکمل گیم اختتام تک کھیلنے والوں کو ایک فرضی چکن ڈنر انعام ملتا ہے۔ بچے اور خاص طور پر نوجوان نسل اس قسم کے ویڈیو گیمز کثرت سے کھیل کر جرام کے نت نئے طریقے

پب جی ویڈیو گیم گیم بنانے والے کمپنی فن لینڈ کی فرم سپریل اور ساوتھ کوریا کی جانب سے بتایا گیا ہے۔ کہ اس پب جی ویڈیو گیم میں موجود اینی میشن کی روشنی سے نکلنے والی شعاعیں کثرت سے گیم کھیلنے والوں میں مرگی کا عارضہ پیدا کر دیتی ہیں۔ اور یہ بھی خبر دار کیا ہے کہ یہ اس جیسے ویڈیو گیم بہت زیادہ کھیلنے سے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ انتہا بھی دیا ہے کہ گیمز میں برق فتاری کا مظاہرہ کرنے کی وجہ سے ہڈیوں اور عضلات کی تکلیف لاحق ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں موبائل پر انگلیوں کی مسلسل حرکت کی وجہ سے ابہام والی انگلی کو بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ ویڈیو گیمز کھیلتے ہوئے آنکھوں کی حرکت تیز ہو جانے کی وجہ سے آنکھوں پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ مقنایی لہریں موبائل اسکرین سے نکلتی رہتی ہیں جسکی وجہ سے آنکھ سرخ اور خشک ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ یہ گیم کھیلنے والوں میں خود اعتمادی کی کمی کے ساتھ نفسیاتی مریض بن کر رہ جاتے ہیں۔ پب جی گیم میں ایسا ہے جس میں گروپ کی شکل میں دوسروں کو قتل کر کے انکی املاک تباہ کر کے ناحق انہیں زد و کوب کر کے لطف اٹھایا جاتا ہے۔ مکمل گیم اختتام تک کھیلنے والوں کو ایک فرضی چکن ڈنر انعام ملتا ہے۔ بچے اور خاص طور پر نوجوان نسل اس قسم کے ویڈیو گیمز کثرت سے کھیل کر جرام کے نت نئے طریقے



ہونے والی محرومیوں اور آخر میں نہتے مشرقی پاکستانی شہریوں پر ٹینکوں اور توپوں سے فوج کشی، قتل عام اور نسلیں بدلنے جیسے جرائم سمیت اس سانحہ کے اصل مجرمات ایک طرف رکھ دیئے اور میرے جوڑے ہوئے چار الفاظ کو ملک ٹوٹنے کا سبب بنادیا۔ یہ لفظ بھٹو صاحب نے کہے ہی نہیں تھے۔ اس سرخی کا پس منظر یہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمن سرحد اور بلوچستان کی قوم پرست پارٹیوں کے ساتھ مل کر اپنے 6 نکات پر مبنی آئینے بنانا چاہتے تھے جس کا مطلب پاکستان کو 5 ملکوں میں تقسیم کرنا تھا۔ میں اس قصہ کو آئندہ کبھی پوری تفصیل سے لکھوں گا لیکن فی الحال میں پیپلز پارٹی میں بھٹو صاحب کے سیاسی وارثوں کو جو میری سرخی کا طعنہ سن کر چپ ہو جاتے ہیں یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ مجیب الرحمن کے 6 نکات اور 70ء کے عام انتخابات سے لیکر

1965ء میں روزنامہ امروز میں میری ان سے جان پیچان ہوئی اور بہت جلد ایک کبھی نہ ٹوٹنے والے تعلق میں بدل گئی۔ ٹریڈ یونین الیکشنوں کے معرکوں اور ہڑتاواں کے ہنگاموں میں قدم قدم پر میں ان کے ساتھ رہا۔ یہی دور میں پی پی ایل کی ہڑتاں ناکام ہونے پر عبد اللہ ملک، آئی اے رحمن، اے ٹی چودھری مر حوم، منہاج برنا، حمید اختر، محمود بٹ اور میرے علاوہ 6 پریس ورکر بطرف ہوئے تھے۔ وہ دن اس وقت بڑے اذیت ناک لگتے تھے اور اب دچسپ یادوں میں بدل گئے ہیں۔ رحمن صاحب، ملک صاحب اور میں دن میں اپنے بیرون گار ساتھیوں کیلئے چندہ جمع کرتے تھے اور رات گئے تک اپنے وکیل کے دفتر میں گھنٹوں ڈیوٹی بھی دیتے تھے۔ وکیل صاحب ہمیں چائے تک نہیں پوچھتے تھے اور ہم مسلسل پانی پلا پلا کر بھجوک



ٹکست مشرقی پاکستان تک کے اخبار پڑھ لیں تاکہ انہیں پتہ چلے کہ بھٹو صاحب نے ملک کے دو ٹکڑے نہیں کر دائے اسے 5 ملکوں میں بٹنے سے بچا لیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں فوجی ٹکست کے بعد اندر اگاندھی مغربی حصہ کو بھی ٹکڑوں میں بانٹنے پر قتل ہوئی تھیں لیکن پاکستان روانگی سے پہلے بھٹو صاحب نے صدر نکسن کو اس باقی ماندہ پاکستان کے وجود کی اہمیت کا قائل کیا اور امریکہ نے سخت ترین کارروائی کی دھمکی دیکر بھارتی فوج کو جنگ بندی پر مجبور کر دیا۔ بھٹو صاحب ہماری تاریخ کے مقبول ترین اور مظلوم ترین لیڈر تھے۔ شورش کشیری مر حوم نے اپنے رسالے میں ان کا ایک فرضی شجرہ نسب چھاپا جس میں ان کی والدہ کو ہندو کہا تھا اور بھٹو کو مر حومہ کے پہلے شوہر کی اولاد قرار دے کر یہ بھی لکھا تھا کہ ان کا پیدائشی نام لگھائی رام تھا۔ اقتدار میں آنے کے بعد بھٹو صاحب نے شورش کا شمیری مر حوم سے یہ ”انتقام“ لیا کہ انہیں غیر معمولی مالی فائدے دیئے۔ دوسرے لفظوں میں شورش صاحب نے جو مانگا، دے دیا اس کے باوجود بھٹو صاحب کو نتقم مزانج کہا جاتا ہے۔

میری یہ سرخی نہ صرف ملک کی صحافی تاریخ کا حصہ بنی بلکہ بھٹو صاحب کیلئے اس طعنے کی بنیاد بن گئی کہ انہوں نے ”ادھر تم، ادھر ہم“ کہہ کر ملک کو دو ٹکڑے کروادیا۔ یہ سرخی میں نے نشرت پارک کراچی کے جلسے میں بھٹو صاحب کی ایک تقریر کے چند جملوں کی تشریح اور تاثر میں سے اخذ کی تھی۔ اس میں میرا اپنا یہ تجزیہ بھی شامل تھا کہ پاکستان دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ ملک ٹوٹنے کے بعد میری یہ سرخی بھٹو صاحب پر فرد جرم بن گئی۔ انسس اور البر جیسی تنظیموں کی سرپرستی کرنے والی جماعت اسلامی کے لیڈروں سمیت پیپلز پارٹی کی تمام مخالف جماعتوں نے ایوب خان کی نا انصافیوں سے پیدا





1۔ ایک فوجی کی نظر میں ہمارے غیر فوجی یا سولیین بھائی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو نیم فوجی سولیین اور ایک خالص سولیین۔ نیم فوجی سولیین وہ ہوتے ہیں جن کا کسی نہ کسی حوالے سے فوجیوں اور ان کی روزمرہ کی زندگیوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اسلئے وہ ان کی سوچ اور بات چیت کی اصطلاحات سے ایک حد تک واقف ہوتے ہیں۔ البتہ خالص سولیین، ہمارے وہ بھائی ہوتے ہیں جنہیں فوج اور اسکے طریقہ کارکناہ میں فوجیوں کا جب کبھی فوجیوں سے وابستہ ہو جائیں۔ مزید استفسار پر قطعاً کوئی علم نہیں ہوتا۔ اسی لیئے ہمارے خالص سولیین بھائیوں کا جب کبھی فوجیوں سے واسطہ پڑتا ہے تو بعض اوقات عجیب شگوف یا لیے جنم لیتے ہیں اور یہی میری اس تحریر کا موضوع ہے۔

2۔ 1974 میں میری رجمنٹ کھاریاں میں تھی اور میں بھیشیت لیٹھنیٹ رجمنٹ کے کواٹر ماسٹر کی ذمہ داریاں سر انجام دے رہا تھا۔ ایک دن مجھے رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر نے حکم دیا کہ اپنی یونٹ کے فیلی کواٹر زکا چکر لگاؤں اور صفائی سترہائی کے لحاظ سے ان کا معائنہ کر کے رپورٹ پیش کروں۔ یہ حکم سن کر میں کواٹر ماسٹر جسے سی او اور دوسرے متعلقہ عملے کے ہمراہ کواٹرزوں کے معائنے کے لیے پہنچ گیا۔ دوران معائنہ، ایک خاتون خاکروب میرے پاس آئیں اور کہا کہ صاحب، فلاں فلاں کواٹروالی بی بی آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہیں۔ کیونکہ وہ کواٹر ہماری ساتھواںی رجمنٹ کا تھا اس لیے میں نے خاتون سے کہا کہ وہ کواٹروالی بی بی سے کہیں کہ وہ اپنی شکایت لکھوادیں اور میں انش اللہ وہ شکایت ان کی رجمنٹ کے کواٹر ماسٹر تک پہنچا دوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد خاکروب خاتون واپس آئیں اور کہا کہ کواٹروالی بی بی آپ سے ہی ملنا چاہتی ہیں۔ اس اسرا ر نے مجھے عجیب کشمکش میں بتلا کر دیا۔ پہلے ہی میرا چال چلن رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر کی نظر میں انتہائی مشکل کھانا اور وہ ایک دو دفعہ مجھے آتے جاتے ہوئے دبے دبے لفظوں میں وارنگ دے چکے تھے کہ میں اپنے لچھن سیدھے کرلوں ورنہ وہ بہت سختی سے پیش آئیں گے۔ اسلیے میں کوئی نئی مصیبۃ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ بہر حال کواٹروالی بی بی کے بے حد اصرار پر میں ہمت کر کے اپنے کواٹر ماسٹر جسے سی او کے ہمراہ

بتایا کہ وہ حوالدار صاحب پر موشن کے نزدیک تھے اس لیئے انہیں ترقی دے کر نائب رسالدار بنادیا گیا اور ایک بڑا کوادر بھی الٹ کردیا گیا۔ وہ خاتون اب مطمئن ہیں کہ چلو ڈسٹرکٹ محکمہ ریٹ کی نہ سی ہی مگر اب وہ ایک جو نیز کمیشنڈ افسر کی بیوی ہیں۔

3- فوجی اصطلاحات سے ناواقفیت کا ایک اور واقعہ مجھے اس وقت پیش آیا جب میں شیکسلا کے ایک معروف دفاعی پیداوار کے ادارے میں سروں کر رہا تھا۔ ایک دن ہماری بیگم صاحبہ کے چچا محترم نے فون کر کے اطلاع دی کہ وہ بمعہ اہل خانہ لاہور سے راولپنڈی آئے ہوئے ہیں اور ہمیں ملنے کے لئے شیکسلا آنا چاہتے ہیں۔ چونکہ چچا جان پہلی بار شیکسلا تشریف لارہے تھے اسلیئے میں نے اپنا پتہ سمجھاتے ہوئے انہیں بتایا کہ جیسے ہی آپ جی ٹی روڈ سے خانپور ڈیم والی سڑک پر مڑیں گے تو تقریباً ایک کلومیٹر کے بعد آپ کو سڑک کے دائیں ہاتھ ایک ٹینک نظر آئے گا جس کے ساتھ ہی ہمارے ادارے کا 4 نمبر گیٹ ہے۔ آپ گیٹ پر گھرے فوجی سنتر سے میرے گھر کا پوچھ لیں، وہ آپ کو گاہی ڈیکر کے میرے گھر تک پہنچا دے گا کیونکہ میرا گھر گیٹ کے بالکل ساتھ ہی ہے۔ کافی دیر کے بعد مجھے چچا جان کا موبائل فون پر پیغام ملا کہ برخوردار ہم بتائی گئی سڑک پر سفر کرتے کرتے خانپور ڈیم تک پہنچ گئے ہیں لیکن ہمیں تو کوئی ٹینک غیرہ نظر نہیں آیا۔ خانپور ڈیم شیکسلا کینٹ سے تقریباً 15 یا 20 کلومیٹر ہری پور کی جانب واقع ہے۔ چچا جان کی بات سن کر میں بڑا حیران ہوا مگر بحث میں الجھنے کی بجائے میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ اسی سڑک پر واپس تشریف لے آئیں، میں سڑک پر گھر اآپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب چچا جان و اپس پہنچ تو میں نے گیٹ کے سامنے نصب اضرار ٹینک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ بھلا اتنا بڑا ٹینک کیسے انہیں نظر نہیں آیا۔ اس پر چچا جان بڑی معصومیت سے بولے ”برخوردار ہم تو پانی والے کسی واٹر ٹینک کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں کیا خبر کہ ٹینک سے آپ کی مراد فوجی ٹینک تھا۔“ چچا جان کی بات سن کر مجھے احساس ہوا کہ واقعی ہماری فوج کی کچھ اصطلاحات ایسی ہوتی ہیں جو ہم فوجیوں کے لیے تو معمول کی بات ہوتی ہیں لیکن جب ہمارے کسی خالص سویلین بھائی کو ان سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ بے چارہ الجھ کے رہ جاتا ہے۔

4- روزمرہ کی فوجی زبان، سول معاشرے کے ماحول میں کیا گل کھلاتی ہیں اس سے وابستہ ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ایک دفعہ ایک فوجی حوالدار چھٹی پر اپنے گاؤں گیا۔ حوالدار بننے کے بعد یہ اس کی پہلی چھٹی تھی۔ رات اس کی ماں بڑے چاہ سے اپنے بیٹے کو سامنے بٹھا کر کھانا کھلانے لگی۔ وہ نیک بخت بڑی محبت سے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے سالن پلیٹ میں ڈال کر دے رہی تھی کہ کچھ دیر بعد حوالدار صاحب گرج دار آواز میں بولے ”اماں ہالٹ (Halt)۔“ ماں نے سمجھا کہ شاندیٹا ہو۔ سالن مانگ رہا ہے اور اس نے پلیٹ میں کچھ مزید سالن ڈال دیا۔ حوالدار صاحب پھر گرجے ”اماں ہالٹ“ اور ماں نے پہلے کی



کی جانب
سے

تمام قارئین کو دل کی گہرائیوں سے

عِیدُ الْأَضْحَى مُبارَكٌ

Eid -Al -Adha Mubarak



Lahore International Magazine

Instagram: @lahoreintl

Twitter: @lahoreintl

Facebook: lahoreinternational

YouTube: lahoreinternational

Google+: lahoreintl

Contact: +447940077825

Whatsapp: +447940077825

Email: lahoreintlondon@gmail.com

والے کمانڈر پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اس آئیں باعث شانعین سے کیا سمجھتا ہے اور اس کا کیا جواب دیتا ہے۔ اکثر شکایات چھٹی نہ ملنے اور یونٹ کا کھانا خراب ہونے سے متعلق ہوتی ہیں۔ فوجی درباروں کی اہمیت بہر حال انتہائی اہم ہوتی ہے کیونکہ اس موقع پر ہی یونٹ کے تمام اہم امور اور مسائل کو زیر بحث لا کر ان کا مناسب حل تلاش کیا جاتا ہے۔ 8۔ میں 1965 سے 1970 تک ملٹری کالج جہلم کا طالب علم رہا۔ ملٹری کالج کی زندگی بھی دراصل ایک مخصوص حد تک فوجی زندگی کا ہی عکس ہے۔ ہمارے کالج کی ایک مشہور اصطلاح "کمبل پر یڈ" ہوا کرتی تھی۔ اس واردات کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ چند طالب علم کسی ناپسندیدہ شخصیت کے حامل طالب علم پر رات کے وقت کسی تہا جگہ کو دیکھ کر اس پر کمبل ڈال دیتے تھے اور پھر وارداتی گروہ کے طلباء حسب توفیق اس عتاب زدہ طالب علم کی لاتوں، گھنسوں اور مکوں سے خوب تواز و فرماتے تھے۔ یہ واردات اتنی سرعت اور مہارت سے کی جاتی تھی کہ بے چارہ مار کھانے والا آخر تک سمجھنا پاتا تھا کہ اسے کون کون مار رہا ہے اور کیوں مار رہا ہے۔ یہ پر یڈ جتنی اچانک اور سرعت سے شروع کی جاتی تھی، اتنی ہی جلدی ختم بھی کر دی جاتی تھی کیونکہ مقصد کسی کونقصان پہچانا نہیں ہوتا تھا بلکہ صرف وارنگ دینا ہوتا تھا کہ تم سدھ جاؤ۔ اس مشہور اصطلاح کا ذکر میں نے فوج میں بھی سنا لیکن پوری سروں کے دوران نہ تو کبھی خود کسی ایسی واردات میں حصہ لیا اور نہ ہی کسی ایسے مظلوم سے واسطے پڑا جو اسے جھیل چکا ہو۔ میرے خیال میں یہ اصطلاح فوج سے متروک ہو چکی ہے لیکن آجکل اپنے اردو گرد پھیلے معاشرتی حالات کو جب دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اس اصطلاح کو نہ صرف دوبارہ زندہ کیا جائے بلکہ ایک قومی ضرورت بھی قرار دیا جائے کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔

9۔ آرمی کی طرح نیوی اور ایئر فورس کی بھی اپنی مخصوص اور دلچسپ اصطلاحات ہیں جن پر کوئی نیوی یا ایئر فورس والا ہی روشنی ڈال سکتا ہے۔ ایک دفعہ میں اپنی بیگم صاحبہ کے چھوٹے بھائی جو نیوی میں تھے، ملنے لگی۔ مجھے دفتر میں بٹھا کر انہوں نے گھنٹی بجائی اور آس بجائے کے حاضر ہونے پر اسے حکم دیا کہ دو سینیڈ ایزی لے آؤ اور ٹوپس کو کھو کر فلاں فلاں جگہ کی صفائی ٹھیک نہیں ہوئی اسے دوبارہ صاف کرے۔ میرے استفسار پر انہوں نے وضاحت فرماتے ہوئے مجھے بتایا کہ چائے غیرہ اور کچھ کھانے پینے کے لوازمات، جن کو ہم فوج میں لی بریک کہتے ہیں اسے نیوی میں سینیڈ ایزی کی جاتا ہے اور خاکروب کو نیوی میں ٹوپس کہا جاتا ہے۔ الغرض افواج کی زندگی کی خوبصورتی انہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے قائم ہے اور ان سے سہی معنوں میں لطف اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ اس زندگی کو قریب سے دیکھا اور سمجھا جائے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس زندگی سے لطف اٹھا رہے ہیں یا اٹھا چکے ہیں۔



لال مسجد آپریشن کے 13 سال

پر پناہ لیے ہوئے ملزمان نے ان پولیس اہلکاروں کو نہ صرف زرد کوب کیا بلکہ انھیں یہ غمال بھی بنایا لیا جس کے بعد اس وقت کے ڈپٹی کمشنر چودھری محمد علی نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے ان پولیس اہلکاروں کو ان کے چنگل سے آزاد کروایا۔ رہائی سے پہلے کچھ مسلح افراد نے اس عمارت کو بھی آگ لگادی تھی جس میں ان پولیس اہلکاروں کو یہ غمال بنایا کر رکھا گیا تھا۔ زبردستی دین پھیلانے، اور مبینہ طور پر لوگوں کے گھروں میں گھنے جیسے واقعات کو ملاحظہ رکھتے ہوئے اس دور میں اسلام آباد میں دنیا کے مختلف سفارت کاروں نے ان واقعات پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا تھا۔ اس کے علاوہ ملک کے خفیہ اداروں نے بھی اس خدمتے کا اظہار کیا تھا کہ جس طرح مدارس کے طلباء سرعام اپنی کارروائیاں کر رہے ہیں تو ایسے حالات میں اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ طلباء اسلام آباد میں مختلف اور بالخصوص غیر مسلم ممالک کے سفارت خانوں کا رخ کر سکتے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کے بعد اس وقت کے فوجی



صدر پر دنیا کی طرف سے ذمہ داروں کے خلاف کارروائی کے لیے دباو بڑھتا چلا گیا۔ ان تمام واقعات کو دیکھتے ہوئے صدر پرویز مشرف، جو اس وقت آرمی چیف بھی تھے، نے ذمہ دار ان کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کیا۔

لال مسجد آپریشن کی تیاری

اسلام آباد پولیس کی سکیورٹی ڈویژن کے ایک اہلکار کے مطابق لال مسجد میں چھپے ہوئے مبینہ شدت پسندوں کے خلاف کارروائی سے پہلے پورے اسلام آباد اور بالخصوص لال مسجد کے قریب چار سیکٹرز کی روکی کی گئی اور ریکی کے لیے نہ صرف متعلقہ تھانے کے انچارج سٹی سرکل کے ایس پی کے علاوہ اس کام کے لیے لاہور سے بھی خصوصی ٹیمیں بلوائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس 120 سپیشل گاڑیاں بھی لاہور سے منگوائی گئی تھیں۔ اہلکار نے بتایا کہ اسلام آباد پولیس نے ریکی کا کام مکمل کر کے کارروائی کے لیے لال مسجد سے کچھ فاصلے پر مختلف مقامات پر مورچے بھی بنائے تھے

سنہ 2007ء میں اسلام آباد میں موجود لال مسجد پر کیے جانے والے فوجی آپریشن کو 13 سال گزر چکے ہیں لیکن آج بھی یہ معاملہ پوری طرح حل نہیں ہوا۔ آج بھی اس دھونکیں سے کبھی کبھی چنگاری نکلتی ہے جو کسی بھی وقت کسی بڑے حادثے کا پیش خیمه بن سکتی ہے۔ اس آپریشن کے بارے میں مختلف وجوہات پیش کی جاتی ہیں۔ کچھ لوگ اس آپریشن کے حق میں بات کرتے ہیں تو کچھ لوگ اس معاملے کو کسی تادیبی کارروائی کے بغیر حل کرنے کا گلہ کرتے ہیں۔ اس فوجی آپریشن کے محکمات آخر کیا تھے؟

دارالحکومت کو بے حیائی سے پاک، کرنا

میں اور جون سنہ 2007ء میں لال مسجد کی انتظامیہ کے زیر انتظام چلنے والے مختلف مدارس کے طلباء اسلام کی ترویج، ملک میں اسلامی نظام کے قیام اور وفاقی دارالحکومت کو بے حیائی سے پاک، کرنے کے لیے متحرک تھے۔ یہ افراد کبھی ویڈیو اور سی ڈیز کی دکانوں پر رکھی ہوئی سی ڈیز کو آگ لگاتے اور کبھی وہ شہر کے

مختلف سیکٹرز میں قائم مساجیں نیٹریز میں بلا اجازت گھس کر وہاں پر کام کرنے والے عملے کو نہ صرف تشدد کا نشانہ بناتے بلکہ انھیں اغوا کر کے اپنے ساتھ بھی لے جاتے۔ لال مسجد انتظامیہ کے کرتا وہرہتا یعنی مولانا عبدالعزیز اور مولانا عبد الرشید غازی کی طرف سے ایسے اقدامات میں ملوث افراد کی کبھی حوصلہ شکنی نہیں کی گئی تھی۔ مدارس کے ان طالب علموں کی طرف سے اسلام آباد کے مختلف علاقوں میں واقع مساجیں نیٹریز سے کچھ چینی باشدوں کو بھی اغوا کیا گیا جس پر چین نے پاکستانی حکومت سے احتجاج کیا تھا۔ کارروباری طبقہ بھی مدارس کے ان طالب علموں سے خوف زدہ تھا۔ وہ یا تو اپنی دکانیں کھولتے ہی نہیں تھے اور اگر ایسا کرتے بھی تو وقت سے پہلے بند کر کے چلے جاتے۔ اسلام آباد کی پولیس ذمہ داروں کے خلاف کارروائی کرنے سے ڈری تھی اور ایسا نہ کرنے کی وجہ سے ایک حساس معاملہ، قرار دیتی تھی۔ پولیس حکام کے دعوؤں کے برکس دو مرتبہ پولیس کی ٹیم جب ذمہ داروں کو گرفتار کرنے کے لیے لال مسجد پہنچی تو وہاں

آپریشن شروع ہونے سے پہلے راشن اکھٹا کر لیا گیا تھا لیکن انتظامیہ کی طرف سے فوجی کارروائی سے پہلے لال مسجد اور اس سے ملحقہ عمارت جہاں طالبات کا مدرسہ جامعہ حفصہ واقع تھا، اور ان کے گھروں کی بھلی اور گیس منقطع کردی گئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آپریشن کے دوسرے دن تین درجن سے زائد افراد کی لاشیں ان کے گھر کے صحن اور جامعہ حفصہ میں پڑی ہوئی تھیں۔ ہارون غازی کے بقول اس آپریشن کے دوران وہاں پر تعینات سکیورٹی گارڈز کے پاس 14 کلاشکوف اور دیگر اسلحہ موجود تھا جو کہ لائننس یافت تھا۔ انہوں نے کہا کہ لال مسجد میں موجود ایک طالب علم نے واکی ٹاکی کے ذریعے اطلاع دی کہ اندر اسلحہ ختم ہو گیا ہے تاہم مولانا عبدالرشید غازی نے واکی ٹاکی کے ذریعے اس تاثر کو زائل کرنے کی کوشش کی تاکہ کہیں آپریشن میں شدت نہ آجائے۔ ہارون غازی کہتے ہیں کہ اس آپریشن کے دوران جب کرفیو میں نرمی کی گئی تو اس موقع پر ان گھروں میں مقید دونوں بھائیوں کی فیملی جن میں خواتین بھی شامل تھیں، وہاں سے نکلیں اور وہ یعنی ہارون غازی بھی اپنی والدہ کے ساتھ وہاں سے نکل گئے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ضلعی انتظامیہ کو اس بات کا علم ہوتا تو وہ انہیں فوری گرفتار کر لیتے کیونکہ ان کے اور ان کی والدہ کے خلاف بھی مقدمات درج تھے۔ انہوں نے کہا کہ جس روز ان کے والد اس آپریشن میں ہلاک ہوئے تو اس سے پہلے بھی وہ اپنے بچوں کے ساتھ رابطہ میں تھے۔ مولانا عبدالرشید غازی جس روز ہلاک ہوئے تو اس وقت کا عدم تنظیم القاعدہ کے رہنماء اسماء بن لاڈن کا ایک پیغام بھی آیا تھا جس میں انہوں نے عبدالرشید غازی کو اسلام کا ہیر و قرار دینے کے ساتھ ساتھ پاکستانی مسلح افواج کے خلاف اعلان جنگ بھی کیا۔ اس فوجی آپریشن میں ہلاک والے زیادہ ترا فراد کی شناخت ڈی این اے ٹسیٹ کے ذریعے کروائی گئی تھی۔

‘برقعہ پہنائیں پہنا یا گیا تھا’

لال مسجد آپریشن کے مرکزی کردار مولانا عبدالعزیز نے مدرس کے طالب علموں کی طرف سے دین اسلام کی ترویج اور فاشی کے خلاف کیے جانے والے اقدامات کو آپریشن کی وجہ قرار نہیں دیا بلکہ ان کے بقول ان کے خلاف آپریشن افغان جہاد کی حمایت کرنے کی بنابر کیا گیا۔ انہوں نے کہا کہ لال مسجد آپریشن کے دوران انھیں مسجد کے باہر سے گرفتار کیا گیا اور وہاں پر موجود سکیورٹی فورسز نے وہاں پر ایک بر قعہ منگوایا اور انھیں بر قعہ پہنچنے پر مجبور کیا گیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ گرفتاری کے بعد جب وہ سرکاری ٹوپی پر امنڑو یوڈے رہے تھے تو اس وقت انہوں نے بر قعہ کیوں نہیں اتنا رات تو اس سوال پر مولانا عبدالعزیز خاموش رہے۔ مولانا عبدالعزیز کے دعوے کے برعکس اس وقت اسلام آباد پولیس کے حکام کا کہنا تھا کہ مولانا عبدالعزیز کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ بر قعہ پہن کر حامی حفصہ کی ان طالبات کے ساتھ جانے کی کوشش کر رہے

تاہم لال مسجد میں چھپے ہوئے لوگوں کو ان مورچوں کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا کہ بعد ان مورچوں میں کسی پولیس اہلکار کو نہیں بھجا گیا۔ سیکورٹی ڈویژن کے اہلکار کے مطابق پولیس نے پہلے اپنی مدد کے لیے رینجرز کو طلب کیا تھا لیکن جب لال مسجد کی طرف سے ہونے والی فائرنگ کے نتیجے میں ایک رینجر اہلکار ہلاک ہوا تو اس کے بعد فوج کو بلانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ سیکورٹی ڈویژن کے اہلکار کے مطابق آپریشن شروع ہونے سے پہلے لال مسجد اور اسلام آباد کی ضلعی انتظامیہ کے ذمہ دار ان ایک دوسرے سے رابطہ میں تھے اور جب فوج کو طلب کیا گیا تو اس آپریشن میں ہلاک ہونے والے عبد الرشید غازی نے ضلعی انتظامیہ کے افسر سے فوج بلانے کی وجہ پوچھی تو بتایا گیا کہ چونکہ بارشوں کا موسم شروع ہونے والا ہے اس لیے ہم نہ سیالب کی تیاریوں کے سلسلے میں فوج کو طلب کیا گیا ہے۔ آپریشن شروع ہونے سے پہلے لال مسجد کی طرف جانے والے تمام راستوں کو خاردار تاریں لگا کر سیل کر دیا گیا اور ان قربی علاقوں میں رہنے والے افراد کو کچھ دنوں کا راشن اکھٹا کرنے اور گھروں سے نہ نکلنے کا حکم دیا گیا تھا۔ سیکورٹی ڈویژن کے اہلکار کے مطابق لال مسجد کے قریب سکول اور سرکاری عمارتوں پر سپیشل سرومنز گروپ کے کمانڈوز اور ماہر نشانہ بازوں کو تعینات کیا گیا تھا جبکہ اس آپریشن کے لیے ٹرپل ون برگلڈ سے تین یونٹس بلائے گئے تھے۔ یہ فوجی آپریشن تین جولائی سے شروع ہوا اور 10 جولائی کو ختم کیا گیا۔ اس آپریشن کے دوران فوج کے ایک لیفٹیننٹ کریل ہارون ہلاک ہوئے جبکہ اس آپریشن کے دوران لال مسجد میں ہلاک ہونے والوں سے متعلق متضاد دعوے ہیں۔ حکومت کا کہنا ہے کہ اس آپریشن میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ایک سو کے قریب ہے جبکہ لال مسجد کی انتظامیہ ابھی بھی یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس آپریشن کے دوران دوسو کے قریب طلباء اور طالبات ہلاک ہوئے تھے۔ اس آپریشن کے دوسرے روز یعنی چار جولائی کو لال مسجد میں پناہ لیے ہوئے مبینہ شدت پسند اور سیکورٹی فورسز کے درمیان فائرنگ کے تباولے میں ایک نجی ٹی وی کے کیمرہ میں اور ڈرائیور کو مکر پر گولیاں لگیں جن میں سے ایک آج بھی بستر پر ہیں جبکہ دوسرے زندگی بھر کے لیے اپانچ ہو گئے ہیں۔ جب تک آپریشن جاری رہا تب تک کتنی ہلاکتیں ہوئیں کسی کو معلوم نہیں تھا تاہم یہ معلومات آپریشن ختم ہونے کے بعد ملیں۔

ہارون غازی کاموٹف

ہارون غازی اس فوجی آپریشن میں ہلاک ہونے والے عبدالرشید غازی کے صاحبزادے ہیں اور جس وقت یہ آپریشن شروع ہوا تو وہ اپنے خاندان کے ہمراہ اپنے گھر میں موجود تھے جو کہ لال مسجد سے ملحقہ تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ مولانا عبدالعزیز بھی ان کے ہمراہ رہتے تھے اور جس وقت آپریشن شروع ہوا تو دونوں بھائیوں یعنی مولانا عبدالعزیز اور عبدالرشید غازی کے خاندان وہاں پر موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ

ہے، میں چلے جائیں گے اور دوبارہ بھی وہ اسلام آباد کا رخ نہیں کریں گے۔ علی شیر کے مطابق سابق فوجی صدر نے اس معاهدے کی منظوری نہیں دی تھی جس کے بعد آپریشن شروع کیا گیا۔

عدالتی کا رواوی

اس آپریشن کے خاتمے کے بعد ایک طویل عدالتی جنگ کا آغاز ہو گیا اور لال مسجد آپریشن کی حقائق معلوم کرنے کے لیے ایک عدالتی کمیشن بھی تشکیل دیا گیا اور اس کمیشن میں پیش ہونے والے افراد کی ایک لمبی فہرست بھی موجود ہے۔ اس آپریشن میں ہلاک ہونے والے افراد کے ورشا کو معاوضے کے اعلان کے علاوہ اس آپریشن کے دوران میں نہدم ہونے والے خواتین کے مدرسے جامعہ حفصہ کی دوبارہ تعمیر کے لیے ضلعی انتظامیہ کی طرف سے سیکٹر ایچ ایٹ میں 20 کنال کا ایک پلاٹ بھی دیا گیا۔ لال مسجد انتظامیہ کا موقف ہے کہ اس آپریشن میں ہلاک ہونے والے کسی بھی شخص کے ورشا کو معاوضہ نہیں دیا گیا۔ اسلام آباد کی ضلعی انتظامیہ نے سپریم کورٹ کے حکم پر جامعہ حفصہ کی تعمیر کے لیے مختص کیا جانے والا پلاٹ منسون خ کر دیا اور ضلعی انتظامیہ نے انھیں اسلام آباد کے نواحی علاقے ترنول میں خواتین کے مدرسے کے لیے 10 مرلے کا پلاٹ دینے کی پیشکش کی ہے جسے لال مسجد کی انتظامیہ ابھی تک قبول نہیں کر رہی۔ لال مسجد آپریشن کے مرکزی کردار مولانا عبد العزیز کے خلاف مقدمات مختلف عدالتوں میں چلائے گئے اور وہ ان تمام مقدمات میں باعزت بری ہو گئے۔ مبصرین کے مطابق لال مسجد آپریشن کو ایک دہائی سے زیادہ عرصہ گزرنے اور درجنوں افراد کی ہلاکتوں کے باوجود آج بھی لال مسجد کا مسئلہ موجود ہے۔ کبھی لال مسجد کی انتظامیہ اپنے حقوق کے لیے مظاہروں کے علاوہ سڑکیں بلکہ کر دیتی ہے اور کبھی ریاست لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کی آڑ میں سڑکوں کو بند دیتی ہے جس کا خیازہ عوام کو ہی بھختا پڑتا ہے۔ (بشکریہ بی بی سی) ﴿

مقابلہ ڈاکو مینٹریز

لاہور انٹر نیشنل کے یو ٹیوب چینل کے لیے مختصر دورانیے کی ڈاکو مینٹریز بنائیں اور انعاماں پائیں۔ زیادہ سے زیادہ ویڈیو بھجوائیں اتنے زیادہ جیتنے کے موقع پائیں۔ ان ڈاکو مینٹریز کا موضوع معاشرتی، معاشری،..... ہو۔ ان ڈاکو مینٹریز کو یو ٹیوب چینل پر اپلوڈ کیا جائے گا۔ تینیکی معاملات کے ساتھ ساتھ ستائج کافیسلہ..... اس کو دیکھے جانے اور ناظرین کی پسندنا پسند دیکھ کر کیا جائے گا۔

ہر ماہ ڈاکو مینٹریز کو انعامات دیئے جائیں گے اور زیادہ سے زیادہ ڈاکو مینٹریز بھجوانے والے کو بھی انعامات دیئے جائیں گے۔

تھے جنہیں سکیورٹی فورسز کی طرف سے جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ پلیس حکام کے مطابق جب مولانا عبد العزیز خواتین کے لیے بنائے گئے واک تھرو گیٹ سے گزرنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہاں پر تعینات ایک لمبی کانٹیبل نے مشکوک جانتے ہوئے اس کی اطلاع وہاں پر موجود پلیس الہکاروں کو دی جنہوں نے جب برقعہ اتارتا تو اندر خاتون کی بجائے مولانا عبد العزیز تھے۔

مشرف چاہتے تو آپریشن کے بغیر معاملات حل ہو سکتے تھے

صحافی اور اینکر پرس حامد میر کا کہنا ہے کہ اگر اس وقت کے فوجی صدر پر ویز مشرف چاہتے تو لال مسجد آپریشن کے بغیر معاملات کو حل کیا جا سکتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت کے اطلاعات و نشریات کے وزیر مملکت طارق عظیم کے علاوہ اس وقت کے وزیر مذہبی امور اعجاز الحق کی مولانا عبد العزیز اور مولانا عبد الرشید غازی سے ملاقات کے دوران وہ بھی موجود تھے اور ان کی موجودگی میں ہی فریقین اس معاہلے کو مذکورات کے ذریعے حل کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ حامد میر کا کہنا ہے کہ پر ویز مشرف اس بات پر آمادہ نہیں تھے کہ آپریشن کو ملتوی کر دیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ پر ویز مشرف نے انھیں آرمی ہاؤس بلا یا اور ان مذکورات کی تفصیلات بھی بتائیں۔ حامد میر کا کہنا ہے کہ انھوں نے اس وقت کے آرمی چیف کو بتایا کہ لال مسجد میں پناہ لیے ہوئے کچھ شدت پسند شفشوں میں کام کرتے ہیں اور ان میں سے کچھ افراد کو گرفتار کر کے پلیس کے حوالے کر دیا گیا جنہیں بعد ازاں جیل بھجوادیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ وزیر داخلہ اور اس وقت کے اٹیلی جنس بیورو کے سربراہ بر گیڈ بیٹر ڈاکیا اعجاز شاہ بھی اس معاہلے کو مذکورات کے ذریعے حل کروانے کے حامی تھے۔ انھوں نے کہا جب وہ اعجاز الحق کے ساتھ مولانا عبد العزیز اور عبد الرشید غازی مذکورات کر رہے تھے تو اس دوران ملکہ اوقاف کی طرف سے ایک لفاف آیا اور جب اس لفافے کو کھولا گیا تو وہ ملکہ اوقاف کی طرف سے ایک خط تھا جس میں لال مسجد سے ملحقة جامعہ حفصہ کو گرانے کے بارے میں کہا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اعجاز الحق جن کے پاس ملکہ اوقاف بھی تھا، نے ایسے کسی بھی خط کے جاری ہونے سے علمی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت کی سول سو سالی اور سپریم کورٹ بار ایسوی ایشن بھی اس معاہلے کو مذکورات کے ذریعے حل کرنے کے حق میں تھی۔ حامد میر کا کہنا تھا کہ مولانا عبد الرشید غازی کی صرف ایک شرط تھی کہ انھیں گرفتار کرنے کے بعد ان کے کپڑے نہ اتارے جائیں۔ اس مذکوراتی عمل کے ایک اور عینی شاہد اور دینی جماعتیں کی سرگرمیوں کی کوتراج کرنے والے صحافی علی شیر کے مطابق حکومتی مذکوراتی ٹیم اور لال مسجد کی انتظامیہ کے درمیان جس معاهدے پر اتفاق ہوا تھا اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ مولانا عبد الرشید غازی اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ اسلام آباد سے اپنے آبائی علاقے رجمان جمالی، جو کہ جنوبی پنجاب میں واقع



تحریر:

قومی اسمبلی کی منظور کردہ حالیہ قرارداد

شعبہ پاکستان

-----ot a Muslim for the purposes of the Constitution or law.

یعنی جو شخص آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے آخری ہونے پر قطعی اور غیر مشروط یہ بیان نہیں رکھتا وہ آئین اور قانون کی اغراض کے لئے مسلمان نہیں ہے۔ اس تناظر میں اس قرارداد کی خلائق کمزوریوں سے قطع نظر اب حکومتی سطح پر اصل یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام خاتم النبیین کے طرف لوٹنے اور اس کے پرچار کی کوشش صحیح سمت میں ایک قدم لگتا ہے۔ اور خیال کیا جاسکتا ہے کہ اگر حقیقی طور پر زور دیا جائے اور دیگر غیر قرآنی اصطلاحات کا استعمال ترک کر دیا جائے تو یہ عمل انجام کا مرکز اور قوم کی بہتری کا موجب ہو سکتا ہے۔ مشاہد اس ترمیم کا بھی افادی پہلو بعض حضرات کو ناپسند ہوا ہے۔ ایک مولوی صاحب نے تو بر ملا اس قرارداد کو موجودہ شکل میں احمدیوں کے لئے مفید بتا کر اس میں مزید تراویم تجویز کی ہیں۔ کسی رحمانیٰ وی پر اپنی ویدیو میں انہوں نے کہا ہے:

A photograph of a modern, multi-story white building with large windows and greenery in front. The building has a flat roof and is surrounded by trees and shrubs. A few cars are parked in front of the building.

اس بیلی میں پھر اس قرار داد کا منظور کیا جانا ظاہر کرتا ہے کہ اگر کوئی مسئلہ تھا تو اب بھی حل طلب ہے۔ اور اس غرض سے کئے جانے والے سارے اقدام، دوسری ترمیم، 1984 کا احمدی مخالف آڑپینس، احمدیوں پر مقدمات اور قید و بند، ان کے خلاف عدالتی فیصلے، ان کے خلاف درپرداز حکومتی ہدایات، ان کی انتخابی عمل سے جبری علیحدگی، ان کی جان و مال پر بار بار حملے، ان کی اجتماعی خون ریزی، ان کے پریس پر پابندی، ان کے خلاف یک طرف جھوٹا پروپاگنڈا، سب اس مسئلہ کے حل کے لئے بے کار اور عسی تھے۔ حل تو ایک ہی تھا اور ہے کہ اللہ کے فرستادہ کو پہچانا اور مانا جائے اور اس راہ کو اختیار کیا جائے جو اللہ نے دین اور اہل دین کی سربازی کے لئے مہیا فرمائی ہے اور جس کی نشاندہی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے فرمائی تھی۔ وگرنہ یہی اندھیرے اور اندھیروں میں ٹاک ٹویاں مقدر بنے رہیں گے۔ ان پہلے لوگوں کی مانند ہم کی مثال میں اللہ نے فرمایا ہے کہ

اللَّهُ يُنورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلْمٍ تِلْكَ لَا يُبَصِّرُونَ (بقرة: 18) ترجمہ: اللدان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ وہ کچھ دکھنے سکتے تھے۔

بظاہر اچانک اگلے دن ایک وفاقی وزیر صاحب نے قومی اسمبلی میں دنیا اور آخرت میں سب کی بخشش کا ذریعہ بتا کر ایک قرارداد پیش کی جس میں لکھا گیا:

‘حکومتِ وقت سے مطالبہ ہے کہ نام درسی کتب اور سرکاری اسکولوں میں جہاں بھی آقا
کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خاص اسم گرامی لکھا، پڑھایا پکارا جائے وہ اس طرح ہو حضور اکرم خاتم
انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم، اپنی نویسیت کے سبب یقیناً رداد بلا کسی بحث کے منظور کی گئی اور
کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ اس کا دائرہ صرف درسی کتب اور سرکاری اسکولوں تک کیوں
محدود رکھا جا رہا ہے اور وہ پرانیویسیت اسکول جہاں معزز اکائیں اسمبلی کے ہچکان تعلیم پاتے
ہیں کیوں اس سے محروم رکھے جا رہے ہیں؟

نہ یہ کہ جب یہ مطالبہ بلا استثنہ ہے تو درسی کتب میں جب کلمہ طبیبہ، کلمہ شہادت اور قرآن کریم کی ان آیات میں سے کوئی جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی آیا ہے لکھی، پڑھی اور پکاری جائیں گی تو کیا ان پر بھی اس قرارداد کا اطلاق ہو گا؟

قرارداد میں اسے پشت کرنے والے کو کوئی وحی نہیں تباہ کرے۔ قساساً کئی وجودات ہو سکتے

بیل۔ یہ کہ عوام کی توجہ کا رخ موڑا جا سکے۔ یہ کہ مذہب پسند عوام کی حکمران جماعت کی تائید میں اضافہ کیا جا سکے۔

یہ کہ مخالف پارٹی جب اپنے گزشتہ کسی خاص تاریخی کام کا پروپاگنڈا کرے تو جو ابا حکمران جماعت بھی اپنے اس تاریخی کام کو پیش کر سکے جیسا کہ وزیر صاحب نما نے تقریباً میں اک قریب ادا

کو کہا بھی ہے۔ شاندار پرده یہ بھی خیال ہو کہ لوگ اسے ایک اور احمدی مخالف کارروائی سمجھ کر حکومت کو اس کا صلمہ دیں گے۔ تاہم اس آخری بات کی حد تک توبیجہ بر عکس ہے۔ احمدی موقف کی یک گونہ پر زیر ای: احمدی ہمیشہ سے یہ کہتے چلے آئے ہیں کہ قرآن کریم میں آں حضرت ﷺ کو اتم انہیں فرمایا گیا ہے اور آپ کے اس منصب پر ایمان شرط ایمان ہے۔ جبکہ عام طور پر اس قرآنی اظہار کو چھوڑ کر بزبان اردو ایک خطاب ’آخری نبی‘ اور ایک غیر قرآنی اصطلاح ’ختم نبوت‘ پر زور دیا جاتا ہے۔ اس ہی کے تحفظ کا دم بھرا جاتا ہے بلکہ وسیلہ روزگار بنایا جاتا ہے۔ 1974 میں جب سیاسی مقاصد کی غاطر، حدود سے تجاوز کر کے احمدیوں کے خلاف قانون سازی کی گئی تو اس دوسری ترمیم میں بھی قرآنی اصطلاح خاتم انہیں استعمال نہیں کی گئی بلکہ یہ لکھا گیا:

A person who does not believe in the absolute and unqualified finality of The Prophethood of MUHAMMAD (صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ), the last of the Prophets or



کشمیر یہ لہو چھپائے نہ چھپے گا، یہ بغاوت دبائے نہ دبے گی

(آخری قسط)

تحریر: یاس راشاد

یہ کس قسم کی تبدیلی ہے؟

باعث کشمیر کی صورتحال کا اندازہ لگانا بھی تک مشکل ہے۔ ہندوستان میں بالائیں بازو

 بھارتی حکمران طبقات کے اس فیصلے نے اس خطے کے استیش کو کوڈھا کے سے توڑ دیا
کے مختلف گروہوں سمیت سول سو سائیٰ کی جانب سے اس اقدام کے خلاف احتجاج کیے
 ہے اور خود اس حکمران طبقے کو بھی اس بات کا اندازہ نہیں کہ ان کے اس اقدام سے آنے
جاری ہے ہیں لیکن الیہ یہ ہے کہ بھارتی کمیونٹ پارٹیوں کے تمام تر دھڑے بھی اس
 اقدام کے خلاف جدو جہد کا کوئی واضح پروگرام دینے میں بکر ناکام نظر آرہے
والے دنوں میں مزید کیا کچھ تبدیل ہو کر رہ جائے گا۔ اپنی بنیاد میں یہ ایک وحشت ناک
 سامراجی اقدام ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے لیکن یہ صورتحال ماضی کے
روایتی مذتی بیانات سے آگے نکل چکی ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندو پاک کے
 ریاستی ایوانوں سمیت تمام تر سیاسی حلقوں میں بحث و مباحثے کے ایک نئے سلسلے کے
آغاز کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں کا ایک سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔ پاکستان کے
 حکمران طبقات گزشتہ 48 گھنٹوں سے اس فیصلے کے حوالے سے کسی واضح موقف کو
سامنے نہیں لاسکے۔ پارلیمان کے دنوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں پیش کی جانے
والی قرارداد میں آڑیکل 370 کا ذکر تک نہیں کیا گیا جس پر حزب خالف کی جماعتیں
 نے عالمی احتجاج بھی کیا لیکن حکومت کی جانب سے پیش کی جانے والی قرارداد
درحقیقت ان حکمران طبقات کی کمزوری، بے بسی اور قابلِ رحم حالت کی عکاسی کر رہی
 ہے۔ درحقیقت بھارتی حکومت کے اس فیصلے نے پاکستانی حکمران طبقات کو انتہائی اور
شائد سب سے زیادہ مشکل صورتحال سے دو چار کر دیا ہے چونکہ پاکستان کے کشمیر پر
 روایتی موقف کا خاتمہ ہو چکا ہے اور نئی صورتحال کے خدوخال کی تفہیم کرنے اور اس کے
ساتھ مطابقت رکھنے والا موقف اپنا ناکوئی آسان کام نہیں رہا۔ محض مذمت کرنے سے
 اس فیصلے کے نتائج سے پیدا ہونے والی صورتحال کو دوبارہ پرانی کیفیت میں بحال نہیں
کیا جا سکتا۔ بھارتی مقبوضہ کشمیر میں اس فیصلے کے خلاف جنم لینے والے متوقع عمل کو
 منظر عام پر آنے سے روکنے کے لیے وہاں نگی فوجی آمریت مسلط کر دی گئی ہے۔ دفعہ
144 کے نفاذ کے ساتھ موبائل فون اور انٹرنٹ سرویس کو بند کر دیا گیا ہے جس کے

نئی صورتحال کی حقیقت کے تقاضے ماضی کی کیفیت سے یکسر مختلف ہو چکے ہیں۔ تبدیل شدہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کا حصہ بن جانے والے بھارتی مقبوضہ کشمیر کے معاملات پر بیان بازی جیسے عمل کو بھی پاکستان کی جانب سے ہندوستان کے داخلی معاملات میں مداخلت قرار دیا جائے گا۔ کنٹرول لائن میں الاقوامی سرحد میں تبدیل ہو جائے گی اور جلد یا بدیراس حقیقت کو چاروناچار تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہو گا۔ یہ ایک بالکل نئی صورتحال ہے جس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنا اور اپنے روائی موقف کو ترک کرنے اور اس کوئی صورتحال سے ہم آہنگ کرنے کا عمل نہ تو آسان ہو گا اور نہ ہی پر امن بلکہ عمل خود پاکستان کے اندر بہت ساری نئی تبدیلیوں اور واقعات کو جنم دینے کا باعث بنے گا۔ پاکستانی ریاست کے جاری داخلی بحران میں ایک نئے غصہ کا اضافہ ہو گیا ہے اور پاکستانی ریاست کے تشخص اور نظریاتی بنیادوں میں شدید دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ پاکستان میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اور واقعات بڑے پیمانے پر پورے خطے پر اثرات مرتب کریں گے جس کے باعث عدم استحکام کا یہ عمل اس پورے خطے کو اپنی پیٹ میں لے گا۔ اس سارے عمل میں عالمی سرمایہ داری کا زوال، دنیا بھر میں رونما ہونے والے واقعات اور اس خطے میں جاری مختلف سامراجی طاقتلوں لڑائی کی شدت جیسے عوامل اس کو مزید دھماکہ خیز بنائیں گے۔ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کی قوم پرست سیاست کی رہی ہی بینادیں بھی سمارہ ہو چکی ہیں اور نئی صورتحال کو سمجھنے کی اہلیت سے بھی عاری اس سیاست پر ہی اب پاکستانی ریاست کو اپنی مستقبل کی کشمیر پالیسی استوار کرنے کی کوشش کرنا پڑے گی اور اس عمل کا حصہ بننے والی سیاست کے تابوت میں یہ آخری کیل تابت ہو گا۔ پاکستانی مقبوضہ کشمیر میں موجود قوم پرستی کی سیاست کرنے والے زیادہ تر دھڑے کبھی بھی پاکستان کے کشمیر پر موقف سے مکمل آزاد کوئی واضح اپنا موقف اپنانے میں کامیاب ہی نہیں ہو سکے۔ موجودہ کیفیت میں ہندوستان کے اس اقدام کی روائی قوم پرستانہ موقف کی بنیاد پر مخالفت درحقیقت پاکستان کے حکمران طبقے کی شدید ضرورت ہے جس کو بنیاد بنتے ہوئے عالمی سطح پر یہ واپیا کر سکیں کہ پاکستانی مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کی اکثریت اس کی مخالفت کرتی ہے اس لئے عالمی طائفیں ہندوستان کو اس فیصلے پر عملدرآمد سے روکنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ اس سلسلے کا آغاز ہو چکا ہے اور کشمیر کے کالج اور یونیورسٹیوں کے طلبہ جن کو فیسوں میں اضافے جیسے بے شمار اپنے بنیادی مسائل کے حل کے لئے احتجاج کرنے کی اجازت نہیں ہے ان کو آج انتظامیہ کی جانب سے ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ اس فیصلے کے خلاف احتجاج میں لازمی شرکت کریں اور ان احتجاجوں میں کچھ قوم پرست دھڑوں نے بھی شرکت کی۔ یہ سلسلہ کچھ روز تک چل سکتا ہے لیکن ان کو کھلی بنیادوں پر کوئی موثر احتجاج نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرا جانب زیادہ تر قوم پرست یا بائیں بازو کے دھڑے اس اقدام کے خلاف جو موقف اپنارہے ہیں اس میں اور پاکستانی حکمران طبقے کے موقف میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔

کے ساتھ محض ہندوستانی قبضے کی مذمت کی جا رہی ہے۔ سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا بھارتی مقبوضہ کشمیر کی سابقہ متنازعہ حیثیت کو ختم ہونے سے روکا جاسکتا ہے یا نہیں اور اگر روکا جاسکتا ہے تو کیسے؟ بھارتی مقبوضہ کشمیر کے عوام پہلے بھی بھارتی قبضے کے خلاف لڑتے رہے ہیں اور آنے والے عرصے میں بھی ان کی یہ جدوجہد جاری رہے گی لیکن فوری طور پر ان کی جدوجہد اس فیصلے پر عمل درآمد کو شائد نہیں روک پائے گی۔ دوسرا جانب پاکستان کے حکمران طبقات کے پاس اس فیصلے کو روکنے کی کوشش کے دو ہی طریقے ہیں پہلا یہ کہ اس فیصلہ کو روکنے کے لیے ہندوستان سے ایک جنگ کا آغاز کیا جائے اور دوسرا یہ کہ عالمی سامراجی ممالک اور نامنہاد انسانی حقوق کے علمبردار عالمی اداروں سے ہندوستان پر دباؤ ڈالنے کے لیے سفارتی ذرائع استعمال کیے جائیں۔ کشمیر کو ہندوستان میں ضم ہونے سے روکنے کے لیے کسی سنجیدہ اور فیصلہ کن جنگ کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں جس کا اظہار پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں وزیر اعظم کے خطاب کے دوران ان الفاظ میں کیا گیا کہ ”اگر جنگ ہوتی ہے اور ہم خون کے آخری قطرے تک بھی لڑیں گے تو آخر میں اس جنگ کو کون جیتے گا؟“ ایسی جنگ کوئی بھی نہیں جیت سکتا“ یعنی سادہ الفاظ میں ہم معدورت خواہ ہیں کہ ہم جنگ نہیں کر سکتے۔

دوسرا جانب عالمی سفارتکاری کے عمل میں پاکستان کا مقام کتنا اہم ہے اس کی وضاحت کے لیے کسی لمبی چوڑی بحث کی بھی ضرورت نہیں۔ اسلامی ممالک کی تنظیم میں بھی اگر پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کو زیادہ تر جیج دی جاتی ہے تو باقی کون سا ایسا ادارہ یا سامراجی ملک ہے جو پاکستان کی غاطر ہندوستان پر اس قسم کا دباؤ ڈال سکتا ہے اور پھر اس دباؤ کی ہندوستان کے لیے اتنی اہمیت ہے کہ وہ اس کے آگے سر تسلیم ختم کر لے گا۔ اس حوالے سے پاکستانی حکمرانوں کی تمام بڑھک بازی کہ ہم کشمیریوں کی حمایت میں ہر حد تک جاسکتے ہیں، محض اپنی خفت و شرمندگی کے تاثر کو کم کرنے سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ اگرچہ چین نے ہندوستان کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جس میں لداخ کے کچھ علاقوں کا چین کا حصہ ہونے کے اپنے دعوے کو بنیادی جواز بنایا ہے جبکہ کشمیر کی عالمی سطح پر تسلیم شدہ متنازعہ حیثیت کو یکطرفہ طور پر ختم کرنے کو ثانوی جواز کے طور پر پیش کیا ہے لیکن چین کے اس بیان سے اس فیصلے کی واپسی ممکن نہیں ہو سکتی۔ پاکستانی ریاست گزشتہ کچھ عرصے میں چین سے اپنی بڑھتی ہوئی قربت کو کم کر کے دوبارہ امریکی سامراج کی جانب جھکا ہے میں اضافہ کر چکی ہے اسی لئے چین اس موقع کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان کو اپنے قریب لانے کی کوشش کر رہا ہے اس لئے چین کی مخالفت کے مقاصد بھی وہ نہیں ہیں جن کی پاکستانی ریاست کو ضرورت ہے اور نہ ہی چین اتنی بڑی سفارتی و مالیاتی طاقت و اختیار کا حامل ہے کہ وہ ہندوستان کو اس فیصلے سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر سکے۔ اس تمام تر کیفیت کے باوجود پاکستان کے پاس سفارتی سطح پر مدد کی اپیل کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔

اس حوالے سے اگر کشمیر کی 4 اگست 2019ء کی پوزیشن کو بحال کرنا ممکن نہیں رہا تو

ہم ہندوستانی حکمران طبقات کے اس اقدام کی بھرپور مذمت کرتے ہیں لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ محض آئین کی ان دشقوں کی بجائی کامطالہ کوئی درست مطالبہ ہے۔ کیا اس مطالے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آئین کی ان شقوں کی موجودگی میں کشمیر پر ہندوستان کا قبضہ جائز تھا جو ان شقوں کے خاتمے کے بعد ناجائز ہو گیا ہے اس لئے اس کو دوبارہ کسی طرح جائز بنایا جائے؟ یہ مطالہ کرنے والے سمجھی لوگ ایسے لبرلز ہیں جو سامر اجی جرکی مذمت اور مخالفت نہیں کرتے بلکہ جرکی ہرشکل کو نامنہاد آئینی اور جمہوری لبادوں میں مخفی رکھے جانے کے حماقتوں ہیں اور کہیں بھی جب یہ جبراپنی اصل صورت میں نہ گاہو کر سامنے آتا ہے تو یہ واپسیا مچا دیتے ہیں کہ اس کو قانون کے چیخڑوں میں لپیٹا جائے۔ کشمیر کی موجودہ صورتحال میں سب سے چھوٹا اور کم ترین مطالہ یہ ہے کہ بھارت اور پاکستان فوری طور پر کشمیر سے اپنی فوجوں کو باہر نکالیں۔ لیکن ان حکمران طبقات اور ان کے نظام کی زوال پذیری اور غلاظت کو مد نظر رکھ کر دیکھا جائے تو ان درندوں سے کسی بھی قسم کا مطالہ کرنا کوئی درست اقدام نہیں ہے بلکہ اس کی بجائے اس خطے کے عوام، محنت کشوں اور نوجوانوں کے سامنے اس حقیقت کو واضح کرنا ضروری ہے جب تک اس حکمران طبقہ کو اس کے نظام سمیت اکھاڑ کر نہیں چینکا جاتا اس وقت تک ظلم اور حکومی و محرومی کو نہیں ختم کیا جاسکتا۔ کشمیر پر جرکی ایک نئی وحشت مسلط کی گئی جس کا خاتمه کسی مطالے کے ذریعے ممکن نہیں بلکہ اس کے خلاف پہلے سے جاری کشمیری عوام کی جدوجہد کو صرف ایک درست انقلابی پروگرام اور حکمت عملی کے ذریعے ہی پایہ تکمیل تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ کچھ قوم پرست دھڑے پاکستان کے معابدہ کراپی کے ذریعے ملگتے بلتنتان کو اپنے براہ راست کنٹرول میں لینے کے عمل اور 70ء کی دہائی میں ملگتے بلتنتان سے باشندہ ریاست کے قانون کی منسوخی جیسے اقدامات کو رو رہے ہیں کہ ان اقدامات نے ہی ہندوستان کو موجودہ تبدیلیوں کا جواز فراہم کیا ہے یعنی اگر پاکستان نے ایسا نہ کیا ہوتا تو ہندوستان موجودہ قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ درحقیقت یہ موقف اسی پاکستان نواز قوم پرستی پر مبنی شعور کی پیداوار ہے جس کے مطابق نامنہاد آزاد کشمیر کو حقیقی معنوں میں آزاد تصور کیا جاتا ہے یا کم از کم ایسا ضرور سمجھا جاتا ہے کہ اس خطے کے لوگوں کو پاکستانی غلامی سے نجات کی کسی فوری جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کا اولین فریضہ ہے کہ وہ پہلے بھارتی مقبوضہ حصے کو آزاد کرائیں اسی لئے یہ قوم پرست پاکستان سے شکایت کر کے اپنے نیم مردہ سیاسی ضمیر کا بوجھہ ہلاک کر رہے ہیں۔ ان قوم پرستوں سے یہ پوچھا جائے کہ جب پاکستان نے یہ اقدامات کے تھے تب آپ نے ان کی مخالفت میں کون سی تحریک چلانی تھی یا اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ اس وقت ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے تو پھر بھی یہ سوال تو بتاتا ہے کہ جب آپ سیاسی طور پر سرگرم ہوئے تھے تب سے اب تک ان اقدامات کے خاتمے کے لئے کون سی جدوجہد کی گئی ہے تو اس کا ان کے پاس کوئی جواب موجود نہیں ہے۔ موجودہ تبدیلی آنے والے عرصے میں اس قوم پرستی کے وجود کے جواز جیسے سوالات بھی پیدا کرے گی۔ کشمیر کا مسئلہ بھارت اور پاکستان سے

پیداوار ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ داری کے خاتمے کی جدوجہد کئے بغیر ہم محض ہندوستان کے سیکولر اور جمہوری ماضی کے کسی نبیٹا بہتر عہد چیزی صورتحال کو واپس لاسکتے ہیں تو اس سے بڑی سیاسی جہالت اور حماقت کوئی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کے سبھی باعین بازو کے دھڑے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اسی حماقت پر بنی جدوجہد میں اپنی توانائیاں برداشت کر رہے ہیں۔ جمہوریت اور سیکولرزم کے تحفظ کے لئے ضروری ہے کہ مودی کی انتہا پسندی کے خلاف جدوجہد کے دائرے کو وسیع کرتے ہوئے ہندوستان میں سو شلسٹ انقلاب کی جدوجہد کی جائے۔ اسی طرح کشمیر کی خصوصی حیثیت کی بحالی کی لڑائی کو ایک انقلابی پروگرام کی بنیاد پر استوار کرتے ہوئے سرمایہ داری نظام کے خاتمے کی جدوجہد میں تبدیل کیا جائے۔ کشمیر کے آشیانی عوام بخوبی جانتے ہیں کہ کشمیر کی خصوصی حیثیت کی اہمیت ان کی لئے ایک علامتی نویعت کی تھی عملًا کشمیر کے عوام بھارتی ریاست کے جس وحشتانہ جروتند کے ساتھ تلے زندگی گزار رہے تھے آئین کی یہ دفعات اس جبر کی شدت میں معمولی سی کمی کرنے میں بھی کوئی کردار نہیں ادا کر سکتیں۔

ہر سرمایہ دارانہ ریاست کا آئین بنیادی طور پر حکمران طبقات کے مختلف دھڑوں کے مابین اس ریاست میں حکمرانی کرنے کے چند منقوص قواعد و ضوابط کی شفشوں کا ایسا مجموعہ ہوتا ہے جس پر معمول کے حالات میں عملدرآمد کیا جاتا ہے اور جب بھی حکمرانوں کے نظام اور مفادات کو ان چند شفشوں کے ذریعے تحفظ دینا ممکن نہیں رہتا تو ان کو یا تو تبدیل کر دیا جاتا ہے یا ان کو روکی کی ٹوکری میں چھینک کر ریاستی طاقت کے نفعے جبرا کو عوام پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے نہ تو ہندوستان کا اور نہ ہی دنیا کے کسی اور ملک کا آئین کوئی ایسی مقدس چیز ہے جس کی تمام وقت میں پوچھ کر نالازمی ہوتا ہے اگرچہ یہ درست ہے کہ ہر ریاست کے عوام نے اپنی جدوجہدوں کے ذریعے اسی آئین کے تحت اپنے لئے کچھ بنیادی جمہوری حقوق حاصل کئے ہوتے ہیں جن کے تحفظ کے لئے جدوجہد کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اس خطے میں سرمایہ داری نظام جس حد تک گل سڑچکا ہے اس کے اندر رہتے ہوئے محنت کش طبقے اور حکوم اقوام کو حاصل نہیں جمہوری حقوق کا تحفظ بھی اب بتدریج ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے وہ تمام سیاسی کارکنان جو کشمیر پر ہونے والے اس ظلم کے خلاف حقیقی جدوجہد کرنے کی خواہش اور جذبہ رکھتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہندوستان سے اس وحشتانہ سرمایہ دارانہ نظام کو سو شلسٹ انقلاب کے ذریعے اکھاڑ پھینکنے کی جدوجہد کو اپنا اولین فریضہ بنائیں۔ اسی طرح پاکستان کے محنت کش عوام اور نوجوانوں کو جو حصے کشمیر کی غلامی کے خلاف ہیں وہ پاکستان کے حکمران طبقات اور سرمایہ داری نظام کے طبقاتی بنیادوں پر سو شلسٹ انقلاب کی لڑائی کو تیز تر کرنے کی جدوجہد کا حصہ بنیں۔ ہر جگہ اس لڑائی کے لئے بنیادی پروگرام کو پاک و ہند سمیت کشمیر کے مختلف حصوں کے غلیظ حکمران طبقات اور سرمایہ داری نظام کے تمام گلے سڑے ڈھانچوں کے خلاف قوی کی بجائے محنت کشوں کی بین الاقوامیت پر بنی طبقاتی بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ کشمیر کی غلامی اور تقسیم اپنی بنیاد میں بر صیغہ کی

ضروری اعلان

ادارہ کے مالی حالات کے پیش نظر اور اس کو جاری رکھنے اور مزید بہتر ترقی دینے کی خاطر ”ماہنامہ لاہور انٹر نیشنل“ اور خواتین ڈا جنسٹ ”آئینی“، لاہور رسالہ ہر وزیرانوں اردو اور انگریزی میں لندن سے شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں رسالوں کو ادارہ اپنی ذاتی مالی حیثیت کے مطابق کئی رسالوں سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ دنیا کے تمام قارئین کے لئے یہ ایک معیاری اور پسندیدہ رسائل ہیں۔ ان کا خاص مقصد معاشرہ کی بہتر اصلاح، سچی کھری صحافت اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ ایک تبلیغی کوشش ہے۔ یاد رہے ایسے اخبارات و رسائل کو جاری رکھنے کے لئے ایک بڑا ادارہ یا بُرنس میں یا اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں میر نہیں۔

آپ تمام سے عاجزانہ درخواست ہے کہ اس کی مالکانہ مالی مد فرم کر اس کا خیر میں اپنا حصہ ڈالئے۔ آپ کی یہ معمولی رقم ہماری ہمت افزائی اور ترقی کا باعث ہو گی۔ آپ اپنی رقم درج ذیل بُرنس میں جمع کرو داسکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

Bank Name:
Lloyds Bank PLC

Account Name:

Lahore International LTD

Account No:

42534160

Sort Code:

30-96-26

IBAN: GB89Loyd

3096242534160



بلوچ کہیں۔ یا رحمان ڈکیت۔

پولیس افسران، قانونی و سرکاری دستاویزات، اہل علاقہ اور شہر کے سیاسی رہنماؤں کی بات مانیں تو اس رحمان بلوج کا لیاری جس نے خود اپنی ماں کو قتل کیا! اور اس کے باپ کو مارڈ الامخالف بابوڈ کیت گروہ کے ان لوگوں نے جو منشیات، بھتے، انواع برائے تاداں اور اس جیسے ہر جرم کے دھندے میں کوئی مخالفت برداشت نہیں کرتے۔ وہ رحمان بلوج جس نے پاکستان کی مقتول وزیر اعظم بنے نظیر بھٹو پر کراچی میں 18 اکتوبر 2007 کو ہونے والے حملے کے بعد انھیں ان کی ذاتی رہائش گاہ بلاول ہاؤس تک بحفاظت پہنچانے کی ذمہ داری نبھائی۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا ایک ایسا شخص جسے کچھ لوگ مسیحا اور سماجی رہنماء کہتے اور سمجھتے ہوں۔ اور کچھ حلقة غریب

علاقے کا جرام پیشہ منشیات فروش مانتے ہوں اس قدر

طاقوتو تھا کہ سابق وزیر اعظم کو اپنی حفاظت کے

لئے اس کی مدد درکار تھی؟ پاکستان، خصوصاً

کراچی کے مخصوص حالات میں اس کا

جواب ہے، جی ہاں۔ مگر! ہماری کہانی

لیاری کی کہانی ہے۔ رحمان بلوج کے

‘گینگ’ کی کہانی بلکہ لیاری گینگ وار کی

کہانی۔ ایک نہیں بلکہ کئی نسلوں کے درمیان

طااقت کے حصول کے لیے بے رحم کشاں کی

کہانی۔ علاقہ گیری کی اس ہوس کا قصہ جس میں

جگری دوستوں کے ہاتھوں ایک دوسرے کے خاندان

قتل ہوئے، بھائی جیسے ساتھیوں نے ایک دوسرے کے سرکاٹ



تمام فریقوں کے ڈمن تو بے حساب شمار تھے مگر دوست صرف

ایک تھا اور وہ تھا پیسے۔ فیاض خان کا کہنا تھا کہ اسی پیے

اور طاقت کے حصول کی رسم کشی جلد ہی مسلح تصادم

میں ڈھلی اور رحمان بلوج کا باپ دادل، بابو

ڈکیت کے ہاتھوں مارا گیا اور دادل کی موت

کے بعد رحمان بلوج کو حاجی لا لو نے اپنی

سر پرستی میں لے لیا۔ یہیں سے طاقتو، دلیر

اور خطروں کا کھلاڑی رحمان بلوج بے رحمی اور

قتل و غارت کے راستے کا ایسا مسافر بن جس نے

پہلے تو اپنی ماں کو ناجائز تعلقات کے شہبے میں خود

گولی مار کر قتل کیا اور پھر کبھی پیچھے ہٹ کر نہیں دیکھا۔ قتل و

غارت اور غنڈہ گردی کا بازار گرم کر دینے والے رحمان نے ایک

روز بابوڈ کیت کو بھی مار کر اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لیا۔ یہ زمانہ تھا جب رحمان بلوج کا

شمائلیاری میں جرم و سزا اور قتل و غارت گری کے ناخداوں میں ہونے لگا تھا۔ حاجی لا لو

کے گروہ میں رحمان بلوج اور حاجی لا لو کے بیٹے ارشد پپو اور یاس عرفات نے مل کر جرم

کی سلطنت کو ناقابل تحریر بنادیا۔ رحمان اور حاجی لا لو کا تعلق اس قدر گہرا تھا کہ حاجی لا لو

کے بیٹے یاس عرفات اور رحمان دونوں کی شادی گولیمار کے سیٹھ یوسف کی بیٹیوں سے

ہوئی۔ مگر! جلد ہی کاروباری حد اور ایک دوسرے کو بینجا دکھانے کی کھینچاتا تھا میں ایک

روز رحمان کی کھٹ پٹ حاجی لا لو اور اس کے بیٹوں سے ہی ہو گئی۔ رحمان کو اندازہ ہو گیا

کہ حاجی لا لو کے زیر اثر رہتے ہوئے جرم کی اس دنیا میں وہ اپنا الگ مقام نہیں بنا

سکتا۔ اپنے ہی گروہ میں مجاز آرائی کے اس ماحول میں رحمان ایک روز کھلے عام لا لو کی

مخالفت پر اتر آیا اور اسی گرمگرمی نے لا لو اور رحمان کی راہیں الگ کر دیں۔ فیاض خان

ذالے، ساتھ کھانا کھاتے دوستوں نے ایک دوسرے کو قتل کیا اور بچپن کے پڑو سیوں

نے ایک دوسرے کی لاشیں تک انتقام کی آگ میں جلا دالیں۔ نسلوں سے نسلوں کو منتقل

ہونے والے جرم کے اس دھندے کے تاریخی پس منظر کو کھنگا لاجائے تو کئی کتابیں لکھنی

پڑیں گی۔ مگر! لیاری گینگ وار کی اس کہانی کو آپ تک پہنچانے کے لئے اس تاریخ سے

گریز کرنا پڑے گا۔ اور بات کہانی کے ڈرامائی موڑ سے شروع کی جا سکتی ہے۔ تو یہ

ڈرامائی موڑ آیا کب؟

یہ بتایا پیشہ و رانہ زندگی کا بیشتر حصہ لیاری میں گزارنے والے پولیس افسران 2008

میں لیاری میں سپرینڈنٹ پولیس تعینات رہنے والے فیاض خان نے۔ یہ موڑ تب آیا

جب لیاری کے علاقے کلاکوٹ کی افشاںی گلی کے دو بھائیوں شیر محمد (شیر) اور داد محمد

(دادل، رحمان بلوج کے والد) نے منشیات کے کاروبار کو پھیلانے اور طاقت حاصل

بہت سمجھدار تھا۔ عزیر تو میرے پاس بھی آتا تھا اور باقی سب سے بھی دوستی رکھتا تھا۔ کسی کو پولیس شنگ کر رہی ہو یا کسی کو بدمعاش و جرام پیشہ عنانصر، عزیر سب کی مدد کرتا تھا اور سب کے کام آتا تھا۔ وہ سب سے بنا کر رکھتا تھا۔

مشترک دشمن ارشد پپو کے ہاتھوں عزیر کے باپ کے قتل کے بعد رحمان نے عزیر کو بالکل دیسے ہی اپنی سرپرستی میں لے لیا جیسے بھی حاجی لا لو نے خود رحمان کی سرپرستی کی تھی۔ لیاری کے ایک دیرینہ کمیں اور بزرگ سماجی شخصیت نے بھی نام ظاہرنہ کرنے کی شرط پر بتایا کہ 18 اکتوبر 2007 کو جب کراچی کے علاقے کارساز کے قریب بنے نظیر بھٹو کے قافلے پر بم محملہ ہوا اور 140 سے زیادہ لوگ مارے گئے تو یہ رحمان بلوچ ہی تھا جو اس وقت بنے نظیر بھٹو کو بحفظ کلفٹن میں واقع ان کی رہائش گاہ بلاول ہاؤس پہنچا سکتا تھا اور پہنچا یا بھی اسی نے۔ مگر پھر وہ وقت بھی آیا کہ رحمان بلوچ اور پیپلز پارٹی کے تعلقات میں دراڑیں پڑ گئیں۔ کراچی پولیس کے ایک سابق افسر کے مطابق لیاری پر رحمان کی گرفت اس قدر مضبوط ہوئی کہ اس نے بالآخر لیاری کی سیاسی وارث سمجھی جانے والی جماعت اور ملک کی حکمران رہنے والی پاکستان پیپلز پارٹی کو بھی دھکیلنا شروع کر دیا۔ کون کو نسل بنے گا اور کون ضلعی ناظم یہ فیصلے بھی رحمان بلوچ کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن لیاری کی اردو آرٹس یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت کے سابق سربراہ اور پھر کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ ابلاغ عامہ میں برسوں تک سینکڑوں صحافیوں کو تعلیم دینے والے پروفیسر (ریٹائرڈ) تو صیف احمد کا کہنا تھا کہ لیاری گینگ وار کے پس پر دھقاں کچھ اور تھے۔ جو مارا ماری آپ نے لیاری میں دیکھی اس کے آغاز کا سرا آپ کو یہاں نہیں ملے گا، سراڑھونڈ نے کے لیے آپ کو بلوچستان جانا پڑے گا۔ پروفیسر تو صیف احمد کا موقف ہے کہ لیاری سے کوسوں دور بلوچستان کی قوم پرستانہ تحریک کو لیاری سے علیحدہ رکھنے کے لیے ملک کی ہمیشہ اور اصلی حاکم ریاست اور اس کے اداروں نے لیاری میں سیاست سے جرم کی بخ کرنی کر دینے کی بجائے ہمیشہ یہ موقع دیا کہ جرم سیاست پر غالب رہے۔ 1973 میں بلوچستان میں جب فوجی کارروائی کا آغاز ہوا تو ڈر تھا کہ لیاری کہیں بلوچ مراجحتی تحریک کا مرکز نہ بن جائے تو لیاری کو علیحدہ رکھنے کے لیے ریاست کے کرتا دھرتاؤں نے اسے جرم کی بھٹی میں دھکیل دیا۔ فوج نے لیاری کو گینگ وار کے حوالے کیا اور پیپلز پارٹی اس میں شریک ہو گئی۔ (پیپلز پارٹی سیاسی وارث تھی لیاری کی) انھوں نے جدو جہد کا راستہ اختیار نہیں کیا آسان راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے مختلف ادوار میں ان گینگسٹرز کی سرپرستی کی۔ نتیجے میں خود پیپلز پارٹی کا بھی بہت بڑا نقصان ہوا یہاں تک کہ سیاست بھی جرام پیشہ عنانصر کی محتاج دکھانی دی۔ مگر! لیاری سے پیپلز پارٹی کے رہنماء، سابق وزیر مملکت پورٹس اینڈ شپنگ اور مختلف ادوار میں

کے مطابق مجاز آرائی کے اس رویتے نے دشمنی کی شکل اختیار کی تو لا لو کے بیٹے ارشد پپو نے کلا کوٹ میں رحمان کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ قسمت کا دشمن رحمان بخ تو نکلا۔ مگر! ارشد پپو کے غیض کا رخ اس کے رشتہ داروں کی جانب ہوا اور ارشد پپو کے ہاتھوں رحمان کے رشتہ دار مارے جانے لگے۔ ادھر رحمان نے بچی کچھی طاقت مجتمع کر کے جو اب ارشد پپو کے رشتہ داروں پر حملوں کا آغاز کیا جن میں بلوچ اتحاد کے رہنماء اور لیاری کی معروف شخصیت انور بھائی جان جیسے متاز لوگ بھی مارے گئے۔ اسی جنگ میں ارشد پپو نے ایک دن بہت ہی فلمی انداز میں حب چوکی کے پاس رحمان کے چاچا کو قتل کیا۔ فیاض خان کے مطابق پپو نے قتل سے پہلے فون پر رحمان کو بتایا کہ سن، میں اس کو مار رہا ہوں، سن اور پھر اس نے رحمان کے چاچا کو قتل کر دیا۔ اسی دوران ارشد پپو اور اس کے باپ حاجی لا لو کے گروہ نے چن چن کر رحمان کے کاروباری مفادات کو بھی نشانہ بنانا شروع کیا۔ فیاض خان کا کہنا تھا رحمان کو لیاری چھوڑ کر بلوچستان جانا پڑا اور تب تک واپس نہیں آ سکا جب تک ارشد پپو میرے ہاتھوں گرفتار ہو کر جیل نہیں چلا گیا۔ پھر رحمان لیاری واپس آیا۔ کراچی میں تعینات رہنے والے ایک اعلیٰ مگر (اب) سابق پولیس افسر نے نام خفیر رکھنے کی درخواست پر کہا نی آگے سنتے ہوئے کہا اب لیاری گینگ وار نے ایک ایسی انگڑائی لی جس نے اس علاقے کو عالمی توجہ خاص کر ذرائع ابلاغ کا چینچنا موضوع بنادیا۔ ارشد پپو کو لیاری کی گلیوں میں ایک مشتعل جھوم نے مار مار کر ہلاک کیا تھا ان کے مطابق فیض محمد (فیضو) نامی ایک ٹرانسپورٹ جو دراصل چاکیوڑہ کے علاقے سنگولین کی جھٹ پٹ مارکیٹ کے قریب بلوچستان جانے والی پبلک ٹرانسپورٹ کے ایک بس اڈے کا ٹائم کیپر تھا، رحمان اور پولیس دونوں کا ہی بیٹیر، تھا یعنی بس ماکان سے بھتہ وصول کر کے رقم رحمان اور پولیس کے مقامی لوگوں تک پہنچتا تھا۔ وہ رحمان کا قربی اور خاص آدمی تھا اور عرصے سے اس کے لیے بھتہ وصول کرتا تھا۔ ارشد پپو نے فیضو سے کہا کہ اب بھتہ رحمان کو نہیں ہمیں دینا ہو گا۔ انکار اور مخالفت پر اس کا بھی وہی انجام ہوا جو لیاری جیسے علاقے میں ارشد پپو یا رحمان کے مخالفین کا ہوتا رہتا۔ ارشد پپو نے فیضو کو انگو اکر کے قتل کر دیا اور یہ فیضو عزیر بلوچ کا باپ تھا۔ اسی "عزیر بلوچ" کا جو شاہید لیاری کی تاریخ کا اس وقت سب سے مشہور نام ہے۔ لیاری میں جرم و سزا کی دنیا کا عالمی شہرت یافتہ کردار "عزیر بلوچ" جسے حال ہی میں سامنے آنے والی معلومات کے مطابق فوجی عدالت نے جاسوسی کے جرم میں 12 برس قید کی سزا بھی سنائی ہے۔ پولیس افسر کا کہنا تھا عزیر اپنی زندگی کے آغاز پر جرم و سزا کی اس دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ وہ لیاری جزل ہاسپٹ میں وارڈ بوانے کی ملازمت کرتا تھا اور عزیر کا باپ تو اسے کراچی پورٹ ٹرست (کے پیٹی) میں فہاری کی حیثیت سے ملازمت دلوانا چاہتا تھا۔ سابق اسی پیٹی لیاری فیاض خان کا بھی یہی کہنا ہے کہ عزیر

تو میں نے انھیں (گینگ وار لارڈز) کو تنبیہ کی کہ 14 روز میں خود کو حکام کے حوالے کر دیں اور وہ تیار ہو بھی گئے تھے۔ میں ان کے نمائندوں کو لے کر صوبائی وزیر داخلہ ذوالفقار مرزا کے پاس گیا اور ذوالفقار مرزا بھی تیار ہو گئے مگر بعد میں دو دن کے اندر اندر پوری لیاری میں خود میرے ہی خلاف وال چاکنگ ہو گئی تو میں سمجھ گیا کہ ذوالفقار مرزا نے معاملات میں رد و بدل کر دیا۔ ذوالفقار مرزا نے عزیر سے کہا کہ تم لوگ نبیل کی باتوں میں نہیں آنا بلکہ میرے لیے کام کرو۔ نبیل گبول کا دعویٰ اپنی جگہ مگر ادھر لیاری میں جرم اور سیاست دونوں ہی پر رحمان اور عزیر بلوچ کا دائرہ اثر برہتھا ہی چلا جا رہا تھا۔

لیاری آپریشن

اس موضوع پر گفتگو کرنے والے کئی الہمایاں لیاری نے کڑیاں جوڑتے ہوئے بتایا کہ یہ وقت تھا جب پیپلز پارٹی کو بھی اندازہ ہوا کہ رحمان کی موجودگی میں لیاری ان کے سیاسی قلعے کے طور پر برقرار نہیں رہ سکتا تو پیپلز پارٹی میں بھی رحمان کے بوجھ سے جان چھڑانے کی سوچ نے گھر کرنا شروع کیا۔ پیپلز پارٹی اور رحمان میں یہی بڑھتے ہوئے فاصلے جواز بننے کے ریاستی اداروں کو رحمان اور گینگ وار کے دیگر کرداروں کے خلاف کارروائی کا موقع ملے۔ سابق ایس پی لیاری فیاض خان بتاتے ہیں ارشد پاؤ کو تو میں نے پہلے ہی گرفتار کر لیا تھا اور وہ جیل پہنچ چکا تھا مگر پورے سسٹم نے طاقت کی اس جنگ میں ایک بار پھر فیصلہ کیا کہ اپنی عملداری کا اظہار کیا جائے۔ پولیس اور شہم فوجی ادارے ریٹبلرز کے حکام، قانون نافذ کرنے والے دیگر اداروں کی مدد سے سرگرم ہوئے اور رحمان بلوچ پولیس مقابلے میں چوہدری اسلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس ’متنازع‘ مقابلے میں اتنا ڈسپیشلٹ کے طور پر مشہور چوہدری اسلام کے ہاتھوں رحمان کے مارے جانے کے بارے میں سرکاری طور پر پولیس کا موقف وہی تھا جو ایس پی فیاض نے بیان کیا مگر کہنے والوں نے اور بہت کچھ کہا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ رحمان تھا تو بلوچستان کے علاقے وندر میں مگر پولیس مقابلے کا مقام بنا کر اپنی کا علاقہ گلستان جو ہر پولیس مقابلے کے حقوق کچھ بھی ہوں مگر رحمان کی بلاست کے بعد اس کے گینگ نے عزیر بلوچ کو سردار بنانے کا فیصلہ کیا۔ لیاری کے بزرگ رہائش نے بتایا کہ اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ عزیر رحمان کی برادری اور قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور اس وقت تک رحمان اور عزیر جرم و سزا اور سیاست دونوں کے لیے مختلف علاقوں میں مختلف ’وار لارڈز‘ یا علاقائی سردار مقرر کر چکے تھے اور گروہ خوب پھول پھول چکا تھا۔ عزیر نے گروہ کی سربراہی سنبھالی تو مارا ماری کا کام بابا لاد لا کی سربراہی میں دیگر نمائندوں سرداروں کے سپرد ہوا۔ کچھ علاقے اور اختیارات استاد تاجو کے سپرد ہوئے اور رحمان کے گروہ کے تمام

لیاری اور عزیر آباد سے رکن صوبائی اور قومی اسمبلی رہنے والے معروف سیاستدان نبیل گبول کا موقف بالکل مختلف تھا۔ ہماری ایجنیز (خفیہ اداروں) کی جانب سے کوئی مدد مجھے کبھی نظر نہیں آئی۔ (گینگ وار لارڈز کو) جو سپورٹ ملی، وہ سندھ حکومت اور ہوم ڈپارٹمنٹ (صوبائی محکمہ داخلہ) کی جانب سے ملتی تھی۔ لیاری کے لوگ پاکستان پرست ہیں وہاں قوم پرست بہت کم تعداد میں ہیں۔ لیاری کے بزرگ میں نے بھی پروفیسر توصیف کی بات کی تو ثیقہ کی۔ ایک وقت یہ آیا کہ پیپلز پارٹی نے نکٹ دیے، بدیا تی ایکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کے مگر پیپلز پارٹی ہار گئی تھی اور رحمان کے حمایت یافتہ وہ تمام امیدوار جیت گئے جن کی وابستگی تو کسی زمانے میں پیپلز پارٹی سے رہی تھی مگر وہ ایکشن رحمان کی مدد اور حمایت سے جیتے۔ پیپلز من کمیٹی کے نامور رہنماء اور عزیر بلوچ گینگ کا سیاسی چہرہ سمجھے جانے والے حبیب جان بلوچ بھی پروفیسر توصیف کی اس رائے سے قطعاً متفق نہیں۔ ایسا نہیں تھا۔ بلوچستان کے لوگوں نے بھی لیاری کے لوگوں پر انحصار نہیں کیا بلکہ انہوں نے تو اپنے لوگوں پر بھی انحصار نہیں کیا۔ لیاری کو تو سب نے نظر انداز کیا۔

لیاری پولیس

بینک اور مالیاتی ادارے تو لیاری کا پتہ دیکھ کر لوگوں کے اکاؤنٹ کھولنے میں ہچکچاتے تھے۔ بنیظ بھتو کے دور میں جب فرست و بینک بینک قائم ہوا تو عدیہ ہوئی کہ اس کی لیاری شاخ کا دفتر لیاری سے میلوں دور بہادر آباد میں قائم کیا گیا۔ بھی کسی بینک نے لیاری کے لوگوں کو کریڈٹ کارڈ تک جاری نہیں کیا تو پھر جب آپ مسلسل لیاری کے لوگوں کو نظر انداز کرتے رہے تو لیاری کے لوگوں نے اپنی بقا کا فیصلہ خود کیا۔ حبیب جان نے الزم عائد کرتے ہوئے کہا۔ ”مال بردار گاڑیوں کا انداز اور دیگر طریقوں سے بھتہ لینے کا دھنہ تو کچھ رابطہ کمیٹی چلا رہی تھی، ایم کیوا یم کی سر پرستی میں اور نام آرہا تھا لیاری گینگ وار کا۔“ لیاری گینگ وار کو گینگ وار کا نام بھی الاطاف حسین نے دیا تھا اور یہی گینگ وار ان کے خلاف ایک مضبوط دیوار ثابت ہوئی۔ متحده قومی مومنٹ (جو اس وقت تک الاطاف حسین کی قیادت میں متحد تھی اور اب ایم کیوا یم لندن کھلاتی ہے) کے سکریٹری اطلاعات مصطفیٰ عزیر آبادی حبیب جان بلوچ کے الزامات اور لیاری کے واقعات سے ایم کیوا یم کے کسی بھی طرح کے تعلق سے مکمل طور پر انکار کرتے ہیں۔ یہ تو پاکستان بننے سے پہلے سے ہی منتیات فروشوں کا نسل درسل چلنے والا دشمنی کا سلسلہ تھا، ہمارا تو بھی کوئی سلسلہ تھا ہی نہیں کبھی اس سب سے۔ لیاری سے جن سیاسی لوگوں کو بے دخل ہونا پڑا ان میں پیپلز پارٹی کے نبیل گبول بھی شامل تھے۔ لیاری کے بزرگ میں نے بتایا رحمان نے نبیل گبول کو علاقہ بدر کر رکھا تھا۔ ادھرنبیل گبول کا کہنا ہے کہ جب میں نے صورتحال بگزتے دیکھی



QUALIFIED CHARTERED ACCOUNTANTS WITH BIG4 EXPERIENCE

FREE TELEPHONE / EMAIL & WHATSAPP SUPPORT

Company Incorporation / Registered Office Address

Private UK Pension Tracing

Personal Income Tax Return investigations

Assets Review for Inheritance Tax

Rental Income Tax Returns

Appealing - Past years HMRC Penalties

UK State Pension Entitlement Review

Preparation / Filing of prior year tax returns

Advise on filling Gaps in UK State Pension

Duplicate - Payslips / P60s

UK State Pension / (Contracted Out) Tracing

SARMAD KHAN | ACA, FCCA

OFFICE 115 LONDON ROAD, MORDEN, SURREY SM4 5HP - UK



CELL +44 (0)7903 416 966

TEL +44 (0)208 646 3666 FAX +44 (0)208 082 5002

EMAIL INFO@SARMADGLOBAL.COM

WEB WWW.SARMADGLOBAL.COM

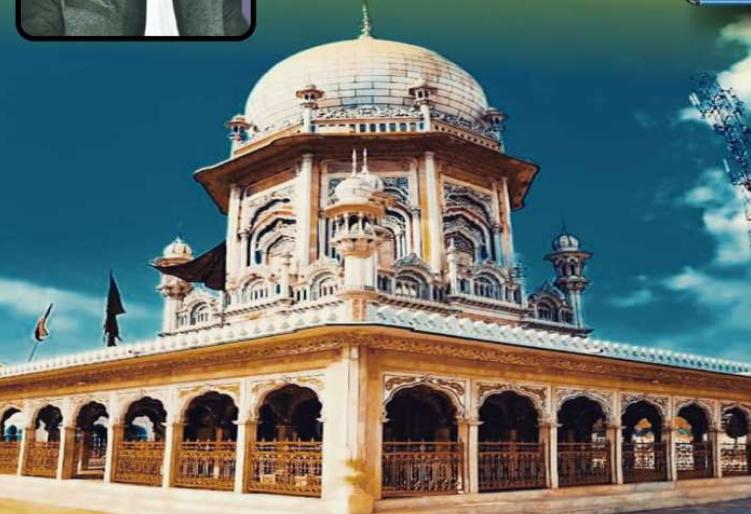
سرداروں نے ایک طرح سے عزیر کی بیعت کر لی۔ ایس پی فیاض خان نے بتایا کہ عزیر کو اندازہ ہو گیا کہ طاقت اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں بندوق ہو۔ یہ بات صحیح ہے۔ بزرگ مکین نے بھی تائید کی۔ ”عزیر کو پتا تھا کہ صرف سیاست سے طاقت اس کے ہاتھ میں نہیں رہے گی۔ بنظیر کے بعد بلاول بھٹو اور آصف زرداری سے بڑا توکوئی سیاستدان نہیں تھا لیاری میں۔ جب بندوق کے سامنے ان کی کوئی نہیں سنتا تھا تو صرف سیاست کرتے ہوئے تو عزیر کی بھی کوئی نہیں سنے گا۔ یہی وجہ رہی کہ عزیر نے گروہ کے تمام جنگجو سرداروں کو ایک ایک کر کے بدلا شروع کیا۔ جب پیپلز پارٹی سے رحمان اور عزیر کی دوریاں بڑھی تھیں تو عزیر کے حمایتی اور رحمان کے قربی ساتھیوں نے ”پیپلز امن کمیٹی“ کی بنیاد بھی رکھ دی تھی۔ پیپلز پارٹی کے سابق رہنماء اور لیاری کی ممتاز شخصیت حسیب جان بلوج ”پیپلز امن کمیٹی“ کی پہچان بھی بنے اور عزیر بلوج کا سیاسی چہرہ بھی سمجھے جاتے رہے۔ لیاری میں طاقت جمع کرتے ہوئے عزیر بلوج نے اپنے لوگوں کو آگے بڑھانے کے لیے نئے مقامی سرداروں کی تعیناتی شروع کی۔ نیا آباد کے علاقے میں اپنے وفادار و سبق لاکھو کو کمانڈر بنایا، بادشاہ خان کے بیٹے وسیم اور شکیل کو دریا آباد میں مقرر کیا۔ استاد تاجو کو آگے بڑھایا، فیصل پٹھان کو بہار کالونی میں لگایا۔ ایس پی (ر) فیاض خان کے مطابق ”بابا لڈلا“ کو محسوس ہوا کہ عزیر اپنی گرفت مضبوط کر رہا ہے تو اس نے اپنے ہی سردار یعنی عزیر بلوج اور اس کے مقرر کردہ سرداروں کی مخالفت کا راستہ چنان۔ اہمیان لیاری بتاتے ہیں کہ عزیر بلوج کے مقامی کمانڈر بھی ”بابا لڈلا“ سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ ظالم بھی بہت تھا۔ یہی وقت تھا جب شہر کی بڑی سیاسی قوت متحده قومی موسومنٹ (ایم کیو ایم) کے عسکری حلقوں اور عزیر کے درمیان علاقہ گیری کی جنگ میں تیزی آرہی تھی۔ عزیر کا گروہ پاؤں پھیلا کر ان علاقوں سے بھتھتے خوری شروع کر چکا تھا جہاں ایم کیو ایم کو سیاسی برتری یا اکثریت حاصل تھی۔ لیاری کی سرحدوں سے جڑے علاقوں پلازہ، تبت سینٹر، صدر، آرام پاٹ، گارڈن، پاک کالونی، نشتر روڈ اور دیگر کئی علاقوں میں لیاری گینگ وار کے کارندے کھلے بندوں بھتھتے کی پر چیاں بازاروں میں بانٹ رہے تھے۔ پھر ان علاقوں میں بلوجوں کے خلاف تشدد میں تیزی آئی اور رچھوڑ لائن سمیت کئی علاقوں میں بلوجوں کی لاشیں ملنے لگیں۔ دوسری جانب نشتر روڈ اور دھوپی گھاٹ جیسے علاقوں میں مسافر بس سے لوگوں کو زبان کی بنیاد پر شناخت کر کے اتارے جانے اور انہوں اور بدترین تشدد کر کے قتل کر دینے کی وارداتیں شروع ہوئیں۔ (حوالہ رپورٹ ہیلپ لائنز 786 نیوز)



تاریخ چنیوٹ



تحریر: محمد شاء اللہ
(بیورو چیف و سطی پنجاب لاہور انٹرنیشنل)



شیش محل

عمر حیات پیلس

ٹیلوں کی تین مختلف مقامات سے کھدائی کرتے ہوئے اس کا 10 فیصد سے زائد حصہ دریافت بھی کر لیا تھا مگر باقی تمام حصہ تاحال مٹی کے ٹیلوں تلے دبا ہوا ہے۔ مکملہ کی طرف سے کام روک دیا گیا ہے۔ منکورہ جگہ پر کھدائی کے بعد نمودار ہونے والی تقریباً تین فٹ چوڑی دیواریں اب واضح و کھائی دیتی ہیں۔ سرگودھا میں تعینات مکملہ آثار قدیمہ کے ایک اعلیٰ عہد دار محمد ایوب کا کہنا ہے، کھدائی کے دوران پہاڑ کے دامن میں شمشان گھاٹ (ہندوؤں کی مردہ جلانے کی جگہ) کے آثار بھی ملے ہیں جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں ایک بڑا شہر آباد رہا ہے۔ انہوں نے مزید بتایا کہ اس یونیورسٹی کی دریافت کے دوران دیواروں میں دبائے گئے ملکے بھی ملے جن میں زمانہ قدیم کے لوگ اپنی قیمتی اشیاء حفظ کر کے دیواروں یا زمین میں دفن کر دیا کرتے تھے۔ مٹکوں میں موجود اُس دور کے زیوارت وغیرہ مکملہ آثار قدیمہ کے پاس محفوظ ہیں۔ محمد ایوب کے بقول مکملہ کو جیسے ہی مزید فنڈر ملے، سرائے پر دوبارہ کام شروع ہو گاتا کہ ہندوشاہی دور میں آباد اس تاریخی شہر اور اُس دور کے لوگوں کے رہن سہن کے بارے میں مزید شواہد حاصل ہو سکیں۔ چنیوٹ سرگودھا اور فیصل آباد کے درمیان میں واقع ہے۔ لاہور جنگ روڈ بھی چنیوٹ میں سے گزرتی ہے۔ یہ لاہور سے 158 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ شہر کا کل رقبہ 10 مربع کلومیٹر ہے اور یہ سطح سمندر سے 179 میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ چنیوٹ کا ہمسایہ شہر چناب نگر (ربوہ) ہے جو دریائے چناب کے دوسرا جانب واقع ہے۔ یہ ذخائر چنیوٹ کے علاقے رجوع میں دریافت ہوئے اور سرکاری بیان دریافت ہوئے ہیں۔ یہ ذخائر چنیوٹ کے پر محیط ہیں جب کہ تقریباً مزید دو ہزار مربع کلومیٹر کے مطابق یہ ذخائر اٹھائیں مربع کلومیٹر رقبے پر محیط ہیں جب کہ تقریباً مزید دو ہزار مربع کلومیٹر کے رقبے میں اسی قسم کے ذخائر ملنے کی توقع ہے۔ بدقتی سے حکومت اس کو جائز طور سے استعمال کرنے سے قاصر ہے چنیوٹ کے نو اجی علاقے چناب نگر (ربوہ) میں واقع پہاڑیوں کے سلسلے کو سرگودھا کے پہاڑی سلسلے کا ہی ایک حصہ مانا جاتا ہے چنیوٹ میں موجود پہاڑ شہر کی تاریخ کا ایک اہم باب ہیں جن سے ملنے والے نوادرات اور نقوش یہاں پر آباد قدیم تہذیبوں کا پتادیتی ہیں۔ سید ماجد بلاں اس تاریخی ورش کی اہمیت اور اسے درپیش خطرات کو

چنیوٹ پاکستان کے صوبہ پنجاب کا ایک شہر ہے، یہ ضلع چنیوٹ کا مرکزی شہر بھی ہے، یہ دریائے چناب کے کنارے واقع ہے، یہاں پر اعلیٰ پائے کے فرنچیز کی وجہ سے پورے ملک میں مشہور ہے.....

وسطیٰ پنجاب میں واقع شہر چنیوٹ اپنے چوبی فرنچیز (لکڑی سے بنافرنچیز)، ہولیووڈ اور مساجد کی وجہ سے مشہور ہے۔ تاریخ سے وابستہ کچھ لوگوں کا مانا ہے کہ لفظ چنیوٹ دو الفاظ "چن" (یعنی چاند اور "اوٹ" (یعنی) کسی چیز کے پیچے کا مجموعہ ہے۔ دریائے چناب اور پہاڑوں کے عالم میں جب چاند پہاڑوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آتا ہے تو دریا میں چاند کی پرچھائی دکش منظر پیش کرتی ہے۔ اسی نسبت سے شہر کا نام چنیوٹ رکھا گیا۔ تاہم چند سال پہلے چنیوٹ میں ایک قلعہ نما سرائے کی دریافت سے شہر کا تاریخی منظر نامہ یکسر تبدیل ہوتا دیکھائی دیتا ہے۔ اس سرائے کے بارے میں خیال ہے کہ یہ 326 قبل مسیح میں راجا چندر گپت موریا کی رانی نے ہندوشاہی دور میں تعمیر کروائی تھی۔ کتاب "چنیوٹ کی تاریخ" میں مورخ لکشمی نارائن لکھتے ہیں کہ رانی چندر شکار کی غرض سے مردوں کے بھیس میں چنیوٹ آیا کرتی تھیں۔ شکار کے لیے پہاڑوں اور دریائے چناب کا عالم اس کی پسندیدہ جگہیں تھیں مگر یہاں رہائش کے لیے کوئی مقام نہ ہونے کے باعث اُسے مشکلات درپیش آتی تھیں۔ تھی اُس نے دریائے چناب کے باعین کنارے پر پہاڑوں کے دامن میں ایک سرائے تعمیر کروائی جس کا نام چندر یوٹ رکھا گیا جس کا مطلب "چندر کے جائے پناہ" ہے۔ اس سرائے کی دیواروں کی تعمیر میں مقامی پہاڑوں کا پتھر استعمال کیا گیا۔ دیواروں کی چوڑائی تین فٹ تھی۔ یہ شاہید چنیوٹ کی زمین پر کھی جانے والی پہلی بنیاد تھی۔ بعد ازاں اس سرائے کے گرد شہر آباد ہوتا گیا جسے چند یوٹ کہا جانے لگا جو آج کل چنیوٹ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس سرائے کو یونیورسٹی کی شکل دے دی گئی جہاں بدھ مت کے اعلیٰ علوم سکھائے جاتے تھے۔ اس یونیورسٹی کا ذکر کئی مذہبی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ مکملہ آثار قدیمہ پاکستان نے سات سال قبل اس سرائے کی دریافت کے دوران پہاڑوں کے دامن میں مٹی کے بڑے بڑے

عملہ تعینات کرنا چاہیے تاکہ چینیوٹ کی تاریخ کو محفوظ بنایا جاسکے۔ نمائندہ خصوصی سے بات کرتے ہوئے ملکہ آثار قدیمہ سرگودھا کے ڈائریکٹر محمد ایوب کا کہنا تھا کہ چینیوٹ سے سرگودھا تک کے تمام پہاڑ تاریخی اہمیت کے حامل ہیں جنہیں محفوظ بنانے کے لیے ملکہ کی طرف سے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ تاہم ان کے بقول فنڈر زکی قلت اور عملہ کی کمی کے باعث ملکہ آثار قدیمہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ”چینیوٹ کے یہ پہاڑ نوادرات کا خزانہ سمیٹنے ہوئے ہیں جن سے اس علاقہ کی تاریخ اور لوگوں کے رہنمائی کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے مگر وسائل نہ ہونے کی وجہ سے فی الحال تحقیق کی بجائے انہیں محفوظ بنانے پر توجہ دی جا رہی ہے۔“ یوں تو چینیوٹ میں کئی مذہبی، ثقافتی، اور تاریخی مقامات ہیں لیکن بادشاہی مسجد چینیوٹ، عمر حیات کا محل، دریائے چناب کا ملی اور حضرت بولی قلندر کا مزار کافی مشہور مقامات ہیں۔

بادشاہی مسجد چنیوٹ

بادشاہی مسجد چنیوٹ جو بادشاہی مسجد لاہور کی طرز پر بنائی گئی ہے چنیوٹ کی خوبصورت اور قدیم ترین مساجد میں سے ایک ہے۔ اسے پانچویں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے وزیر سعد الدلخان نے ستر ہویں صدی عیسوی میں تعمیر کروایا مسجد مکمل طور پر پتھر کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے تمام دروازے لکڑی کے بننے ہوئے ہیں اور آج تک اس کے دروازے بغیر ٹوٹ پھوٹ کے اپنی جگہ قائم ہیں۔ بادشاہی مسجد لاہور کا فرش سفید سنگ مرمر کا بننا ہوا ہے۔ مسجد کے چحن کا فرش سنگ مرمر سے بناتھا۔ اسے 2013ء میں سنگ مرمر سے اینٹوں کے فرش میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاہم مسجد کا اندر ورنی فرش ابھی تک سنگ مرمر کا ہے۔ مسجد کے سامنے موجود شاہی باغ مسجد کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے۔

چینیوٹ کا عمر حیات محل

چنیوٹ کے مرکز میں واقع لکڑی کی بنی اس عمارت کو چنیوٹ کا تاج محل اور گلزار منزل بھی کہا جاتا ہے۔ 14 مرل رقبہ پر مشتمل یہ شاندار عمارت تہہ خانے اور پانچ منزلوں پر مشتمل تھی تا، ہم اب دو بالائی منزلیں خستہ حالی کی وجہ سے ختم ہو چکی ہیں۔ محل کو لکھتے کے ایک معروف تاجر شیخ عمر حیات نے اپنے خاندان کیلئے تعمیر کروایا تھا، 1935 میں جب یہ شاندار محل اپنی تعمیر کے آخری مرحلے میں تھا اور شیخ عمر حیات کی ناگہانی موت واقع ہو گئی۔ شیخ عمر حیات کی وفات کے بعد یہ محل تو مکمل ہو گیا مگر عمر حیات کی بیوہ فاطمہ اپنے بیٹے گلزار اور بیٹی حسینہ کے ساتھ اس محل میں منتقل نہ ہو سکیں اور محل بند پڑا رہا۔ اسی عرصے میں ان کی بیٹی حسینہ کا تپ دق سے انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد فاطمہ نے اس محل کو آباد کر نیکا فیصلہ کیا اور 1937 میں اپنے بیٹے گلزار کی شادی کی، لیکن شادی کے اگلے ہی روز گلزار کی پراسرار موت ہو گئی، بیوہ ماں نے بیٹے کا جنازہ نہ اٹھنے دیا اور اسے محل کے برآمدے میں ہی دفن کر دیا۔ اور اب اسے گزشتہ چند سالوں سے لا بجیری میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

چیزوٹ کا پل ترمیم

چنیوٹ کا پل (یار بودہ کا پل) کنکریٹ (concrete) سے بنائیک پل ہے۔ جو چنیوٹ میں دریائے چناب پر واقع ہے۔ یہ 520 میٹر لمبا ہے جبکہ 17-8 میٹر چوڑا ہے۔ یہ ختم نبوت چوک سے 6.04 کیلومیٹر اور چنیوٹ ریلوے شیشن سے 3.03 کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

چنیوٹ کا شیش محل ترمیم

چنیوٹ شہر کے عین وسط میں واقع بھاڑوں کی اوٹ اور قمیرستان سے ماحقہ علاقے میں

سامنے لائے ہیں، ماہرین کا مانتا ہے کہ یہ پہاڑیاں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں جو اپنے اندر بہت سے تاریخی راز اور نوادرات سمیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف سرکاری سرپرستی میں پتھر کے حصول کے لیے کی جانے والی کٹائی اور بارود کے ذریعے ہونے والی توڑپھوڑ سے بھی اس قدیم تاریخی ورثہ کو نقصان پہنچا ہے۔ یاد رہے کہ 2005ء میں غیر سرکاری تنظیم چنیوٹ لوک کی جانب سے پہاڑیوں میں موجود تیقی نقوش اور آثار کو بچانے کے لیے عدالت کا دروازہ کھلکھلا�ا گیا تھا جس کے بعد جسیں شیخ عظمت سعید نے ان پہاڑیوں میں کرنٹ، بلاستنگ اور کسی بھی طور سے انہیں نقصان پہنچانے کے عمل پر بذریعہ ٹے آرڈر روک لگا دی تھی۔ ان قدیم پہاڑوں پر موجود نشانات سے ماہرین آثار قدیمہ ابھی تک یہ اندازہ نہیں لگایا ہیں کہ یہ ہڑپ تہذیب کی تحریر ہے یا پاپھر محض چنانی نقوش اور اگر یہ کوئی

خاص تحریر ہے تو کس اور کتنی پرانی تہذیب کی؟ چٹانوں پر قدیم ادوار میں بنائے جانے والے نقش واضع نظر آتے ہیں ریثاڑہ پروفیسر محمد حیات خوشناب کے علاقہ جو ہر آباد کے رہائشی ہیں اور کتاب "چٹانوں میں تاریخ" کے مصنف ہیں۔ پروفیسر حیات کو خدا شہ ہے کہ کہیں تحقیق سے قبل ہی قدیم تحریر کے حامل یہ پتھر، نوادرات ما فیا چوری نہ کر لے یا یہ تحریر یہ قدرتی شکست و ریخت کے عمل سے ختم نہ ہو جائیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ انہوں نے نصف صدی قبل یہ نقش دریافت کیے اور آج تک ان کو بچانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں مگر جن آثار کو بین الاقوامی ورش فرار دیا جانا تھا انہیں ان کی نظروں کے سامنے بجری کا ڈھیر بنا کر سڑکوں میں دفن کر دیا گیا۔ ان پہاڑوں میں تاریخی اہمیت کے حامل پتھر موجود ہیں مگر افسوس کہ موڑوے کی تعمیر کے لیے چٹانوں کو توڑا گیا اور نوادرات کا ایک بڑا حصہ

ضائع ہو گیا۔ ان کے مطابق چنیوٹ کی پہاڑیاں ہی وہ مقام ہیں جہاں سکندر اعظم کا یہاں دریائے چناب کے بھنور میں پھنسا تھا، جس کے بعد سکندر نے یہاں قیام کیا۔ انہوں نے بتایا کہ سکندر اعظم نے اپنی جنگی مہم کے دوران ان پہاڑوں کے اوپر سے ایک پختہ سڑک تعمیر کروائی تھی جسے سکندر کا درہ کہا جاتا تھا مگر کثائبی کے دوران اس درے کا آدھے سے زیادہ حصہ باروں کے ذریعے تباہ کر دیا گیا ہے۔ ابھی بھی چناب نگر میں چونگی نمبر تین کے قریب واقع پہاڑی پر اس درے کا باقی ماندہ حصہ موجود ہے لیکن دھماکوں کے باعث پہاڑ کی چوٹی تک جانے کے تمام راستے ختم ہو چکے ہیں۔ پہاڑوں سے مختلف انواع کے فیضی پتھر اور نوادرات ملی ہیں گورنمنٹ تعلیمیں الاسلام کا ٹھنڈا چناب نگر (ربوہ) میں تاریخ کے پروفیسر وقار حسین کا کہنا تھا کہ چنیوٹ میں قیام کے دوران سکندر اعظم کا گھوڑا ایباری کے باعث مر گیا جس کی یاد میں سکندر نے پہاڑ پر اس گھوڑے کا مجسمہ بنوایا تھا۔ ان کے مطابق مقامی لوگ تو ہم پرسی کے سبب اس قدیم مجسمے سے منتیں مانگنے لگے، جس کے بعد 2005ء میں تاریخی اہمیت رکھنے والے اس مجسمہ کو چند افراد نے بارود کی مدد سے تباہ کر دیا۔ ان کے بقول ”دودھائیاں قبل انہی پہاڑوں میں واقع چٹاں پر ایک خاتون کا مجسمہ بھی نصب تھا جو پتھر توڑنے کے لیے کیے جانے والے دھماکوں کی نظر ہو گیا۔“ انہوں نے مزید بتایا کہ ونوٹی والا دھر گنگر کے علاقے سے چند سال قبل بھی نہیں نامٹی کا مجسمہ ملا تھا جسے بعد ازاں حکمہ آثار قدیمه نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان پہاڑوں پر تیز دھار آئے سے بنائے گئے ایسے نقوش ملے ہیں جن کے ذریعے سے چھوٹوں، گھٹسوں اور جنگ کی منظر کشی کی گئی ہے۔“ ان نقوش سے ثابت ہوتا ہے کہ ان پہاڑوں پر جنگیں بھی لڑی گئی ہیں اور یہاں مختلف ادوار میں جنگجو بادشاہ اور قبلے بناء لئتے رہے ہیں۔“ ان کا موقف تھا کہ حکومت کو ان پہاڑوں کی سرستی لئتے ہوئے یہاں

موجود بیناروں سے نکلنے والی روشنیاں جہاں پورے علاقے کو جگ کر دیتی ہیں وہیں
قوالی کے ساتھ بجھنے والے ساز بھی فضاء میں محبت بھرنے سے بچنے لئے رہتے۔ یہ روشنی محلہ
مسکین پورہ میں موجود حضرت احمد ماہی المعروف سائیں سکھ کے سازھے دس کنال پر پھیلے
مزار میں لگے بر قیقتوں کی ہوتی ہے۔ جب یہ روشنی محلہ کی دیواروں میں نسب شیشے پر
منعکس ہوتی ہے تو عمارت کے اندر وہی حصے میں انکاس کی وجہ سے بلوری چک پیدا ہوتی
ہے جو مزار کی خوبصورتی کو مزید بڑھادیتی ہے۔ حضرت احمد ماہی المعروف سائیں سکھ
چنیوٹ کے معروف شیخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کی پیدائش 1914ء جبکہ وفات
1987ء میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سائیں سکھ نے اپنی ذاتی زمین پر دربار کی تعمیر 1925ء
میں شروع کرواتے ہوئے اسے اپنی زندگی میں ہی مکمل کروالیا تھا اور مریدین سے کہا تھا کہ
تیسی کا نڈی چلتی رہے گی۔ سائیں سکھ کے حکم کے مطابق دربار میں مرمت اور سجاوٹ کا
کام سارا سال چلتا ہے مقامی لوگوں کا مانا ہے کہ یہ ان کے الفاظ کی ہی برکت ہے کہ ان کی
وفات سے اب تک یہاں کوئی نہ کوئی ترقیاتی کام ہوتا رہتا ہے۔ اس وقت یہاں ایک دلش
منیار تعمیر کروایا جا رہا ہے جس پر انتظامیہ کے مطابق اب تک کروڑوں روپے لاغت آچکی
ہے۔ اس مزار پر چاند کی ہر چودھوی رات کو محفل کا انعقاد کیا جاتا ہے، لنگر تقسیم ہوتا ہے اور
قوالی کی محفل بھی منعقد ہوتی ہے۔ دربار پر سال میں دو عروسوں کا اہتمام ہوتا ہے، پہلا عرس جو
بڑا عرس سائیں سکھ کی بیوی عائشہ بی بی کی تاریخ وفات پر ہوتا ہے کیونکہ یہ عرس سائیں نے
پہلی بار اپنی زندگی میں 6 اگست 1984ء کو خود کروایا تھا۔ دوسرا عرس ان کی اپنی وفات
2 دسمبر 1987ء کے بعد شروع ہوا جس میں شرکت کے لیے اندر وہن اور بیرون نلک میں
تعمیر شیخ خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد کی کشیر تعداد چنیوٹ آتی ہے۔ دربار کے گردی
نشین باہبیش احمد بتاتے ہیں کہ ”سائیں جی نے اپنی زندگی میں اس دربار کی تعمیر کے لیے کسی
سے ایک روپیہ بھی نہیں لیا تھا۔ انہوں نے اپنا گھر بنانے کی بجائے یہ دربار بنایا۔“ مزار کی
تعمیر پر اب تک اربوں روپے خرچ ہو چکے ہیں۔

چنیوٹ کا مندرجہ ترمیم

چنیوٹ کے محلہ لاہوری گیٹ میں واقع گورنمنٹ گرلز پرائمری سکول حکمہ اوقاف کی ملکیت
ایک پرانے مندر میں قائم ہے۔ یہ مندر قیام پاکستان سے قبل 1930ء کی دہائی میں تعمیر کیا گیا
تھا جسے کرتاری لال یا کلال مندر کہا جاتا ہے جبکہ یہاں سے گزرنے والی سڑک کو بھی مندر روڑ
کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مندر کی عمارت تین منزلوں پر مشتمل ہے جس میں سب سے نیچے
والی منزل میں سکول جکبہ بیرونی طرف 11 دکانیں اور ایک گودام موجود ہے جبکہ دوسرا منزل کو
خشتہ حالی کے باعث بند کر دیا گیا ہے۔ اس عمارت کی چھت پر خستہ حال مندر کے کلس اور
چوبرجیوں کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ 1947ء میں جب ہندوستان اور پاکستان کے نام
سے دونے ملک وجود میں آئے تو یہ مندر تعمیر کے آخری مرحل میں تھا تاہم ہندوآبادی کی بڑی
تعداد بھرت کر کے بھارت چل گئی جس پر اسے حکمہ اوقاف کی تحول میں دے دیا گیا۔ قیام
پاکستان کے بعد بھی کبھار چنیوٹ کے قدیم ہندو باشندے اس کی زیارت کرنے کے لیے
یہاں آ جاتے تھے لیکن دسمبر 1992ء میں جب بھارت میں بابری مسجد کو شہید کیا گیا تو اس
کے بعد ہندو زائرین کی آمد کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اس موقع پر یہاں بھی لوگوں نے احتجاج کرتے
ہوئے مندر کو سما کرنے کی کوشش کی جو انتظامیہ کی مداخلت کے باعث کامیاب نہ ہو سکی۔ قیام

لاہور انٹرنیشنل بین الاقوامی ترجمان ہے۔

ملک کی سیاسی، سماجی، مذہبی، ادبی، معاشرتی
اور ثقافتی صورت حال کا تجزیہ تعلیم و تدریس و
تربیت سے متعلق اہم مضامین کا آئینہ دار
ہے۔



ہم آج بھی جگنی سے باہر نہیں آتے



تحریر: الیاس بابر اعوان

لبڑا، کانسپل اور پواری سے شروع ہوتی تھی، وائرائے تک جاتی تھی۔ یہ وائرائے ملکہ کے گورے غلام ہوتے تھے۔ ان لوگوں کو کیا کیا پروٹوکول حاصل تھا، یہ تمام معلومات ایک سرکاری ڈائری میں درج ہوتی تھیں۔ یہ ڈائری *بیوی بک“ کہلاتی تھی۔ یہ بیوی بک ڈپٹی کمشنر کے قبضے میں رہتی تھی، وہ اسے سرکاری تجویزی میں رکھتا تھا اور اس کے علاوہ کوئی شخص اس ڈائری کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر تبدیلے کے بعد اس وقت تک چارچ نہیں چھوڑ سکتا تھا جب تک وہ بیوی بک نئے ڈپٹی کمشنر کے حوالے نہیں کر دیتا تھا۔ ملکہ کا ایک حکم سلطنت کی بیوی بک بدل دیتا تھا۔ ملک کے تمام معززین ذلیل ہو جاتے تھے اور ذلیلوں کو درجے مل جاتے تھے۔ ملکہ وکٹوریہ نے جون 1887ء میں اپنی تاج پوشی کی گولڈن جوبیلی منای۔ ملکہ کی گولڈن جوبیلی کی تقریبات پوری سلطنت میں منائی گئیں۔ ان تقریبات میں دو اہم ترین چیزیں شامل تھیں۔ ایک ملکہ نے اپنی سلطنت کے تمام بڑے شہروں میں اپنے نام کی یادگاریں بنوائیں۔ یہ یادگاریں آج بھی برطانوی راج کے تمام بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ کراچی کی ایک پریس مارکیٹ ملکہ وکٹوریہ کی اُسی گولڈن جوبیلی کے موقع پر تعمیر ہوئی تھی۔ دوسرا، لندن سے ہندوستان تک ملکہ کے نام سے *جوبیلی مشعل“ نیکی۔ اس مشعل نے ملکہ کی پوری سلطنت کا چکر لگایا۔ یہ مختلف ملکوں اور مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی۔ مشعل ہندوستان کے ایک ضلعے میں آتی، ضلع بھر کے لوگ ڈھول تاشوں سے اس کا استقبال کرتے، آتش بازی کا مظاہرہ ہوتا۔ گانے گائے جاتے اور ڈنس کیے جاتے۔ یہ مشعل اس عالم میں پورے ضلع کا چکر لگاتی۔ مشعل کا چکر مکمل ہونے کے بعد ڈپٹی کمشنر ضلع کی سرحد پر پہنچ کر مشعل دوسرے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے حوالے کر دیتا۔ مشعل کا اگلا سفر شروع ہو جاتا۔ یہ مشعل ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی پنجاب پہنچی۔ تو پنجاب حکومت نے جوبیلی کے نام سے ایک طویل پنجابی گانا تیار کر دیا۔ یہ گانا قصور کے دو بھائیوں نے تیار کیا تھا۔ یہ آن پڑھ تھے۔ جوبیلی کا لفظ اُن کے منہ پر نہیں چڑھتا تھا چنانچہ انہوں نے جوبیلی کو *جگنی“ بنا دیا۔ ان نامعلوم فنکاروں نے اس *جگنی (جوبیلی)“ میں پنجاب کے تمام علاقوں کی ثقافت بیان کی۔



ملکہ وکٹوریہ تاج برطانیہ کی ساتوں ملکہ تھی۔ یہ 20 جون 1837ء میں ملکہ بنی۔ اور 22 جنوری 1901ء تک ملکہ رہی۔ یہ اس لحاظ سے برطانیہ کی طویل المدت ملکہ تھی۔ یہ 63 سال 7 ماہ اور دو دن مسندِ اقتدار پر جلوہ افروز رہی۔ وکٹوریہ کے دور میں انگریز سلطنت میں حقیقتاً سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ گرہ ارض پر سورج کی پہلی کرن نیوزی لینڈ میں پڑتی ہے۔ نیوزی لینڈ برطانوی سلطنت کا حصہ تھا۔ سورج نیوزی لینڈ کے بعد جوں جوں آگے بڑھتا تھا، اس کے راستے میں آنے والے تمام نلک، تمام زمینوں پر برطانیہ کا یونین جیک لہراتا تھا۔ سورج جب تھک کر آنکھیں موند نے لگتا تھا تو نیوزی لینڈ میں دن کا آغاز ہو جاتا تھا۔ لہذا یوں ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں برطانوی سلطنت پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ نے دنیا کو بے شماری چیزیں، نئی روایات بھی دیں۔

یہ روایات، یہ چیزیں آج تک موجود ہیں۔ مثلاً دنیا میں آج بھی وکٹوریہن طرز تعمیر موجود ہے۔ وکٹورین فرنچ بھی آج تک بنایا جاتا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ جس طرز کی بھی استعمال کرتی تھی وہ بھی بعد ازاں پوری سلطنت میں عوامی سواری بنی اور وہ وکٹوریہ کہلانی، یا وکٹوریہ تانگہ کہلانی۔ برطانیہ میں بہادری کا سب سے بڑا اعزاز آج بھی وکٹوریہ کراس کہلاتا ہے۔ اور دنیا میں پروٹوکول کا جدید نظام بھی ملکہ وکٹوریہ نے وضع کیا تھا۔ ملکہ نے *وی آئی پی“ اور *وی وی آئی پی“ کی باقاعدہ کلینگریز بنوائی تھیں اور اس کی پوری سلطنت میں لوگوں کو ان کلینگریز کے تحت سرکاری پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ انگریز دور میں تحصیل کی سطح پر *گرسی نشین“ اور *سفید پوش“ دو اعزازی عہدے ہوتے تھے۔ گرسی نشین کا نام بھیل گاؤں کے اُس شخص کو ملتا تھا جا انگریز کو گھوڑے، فوجی اور مجرمی دیتا تھا۔ کذری نشین کو سرکاری دفاتر میں سرکاری افسروں کے سامنے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ جب کہ باقی لوگ زمین پر بیٹھتے تھے یا زیادہ سے زیادہ افسر کے سامنے کھڑے ہو سکتے تھے۔ جب کہ سفید پوش وہ معزز لوگ ہوتے تھے جنہیں سرکار اُن کی وفاداریوں سے خوش ہو کر ہر سال سفیدرنگ کے دو جوڑے عنایت کرتی تھی اور یہ لوگ یہ کپڑے پہن کر سرکاری دفتروں میں جاتے تھے۔ سرکاری پروٹوکول سفید پوشوں اور گرسی نشینوں سے شروع ہوتا تھا اور ملکہ تک جاتا تھا۔ اُس دور میں سرکار

جگنی گئی ملتان"

یعنی جو بلی کی مشعل ملتان چلی گئی۔

جگنی گئی گجرات"۔ وغیرہ وغیرہ

یہ جگنی اُس دور میں پورے ہندوستان میں مشہور ہو گئی۔ ملکہ وکٹوریہ کو مرے ہوئے 113 سال ہو چکے ہیں لیکن اُس کی جگنی۔ آج تک ہندوستانی پنجاب اور پاکستانی پنجاب دونوں میں زندہ ہے۔ دنیا سے صرف ملکہ وکٹوریہ رخصت نہیں ہوئی بلکہ اس کی سلطنت بھی آہستہ آہستہ بند مٹھی کی ریت کی طرح زمین پر بکھر گئی۔ اور آج برطانیہ صرف برطانیہ تک محدود ہو چکا ہے۔ اب سوال یہ ہے دنیا کی اتنی بڑی سلطنت ختم کیسے ہو گئی۔ وہ برطانیہ جس کی ملکہ کی مشعل 68 ممالک میں گھمائی گئی تھی؟ وہ برطانیہ آج صرف دولاکھ 43 ہزار 6 سو 10 مربع کلومیٹر تک محدود ہو کر کیوں رہ گیا؟

اس زوال کی بے شمار و جوہات میں سے ایک وجہ گروں کی بیویوں کی پروٹوکول بھی تھا۔ گروں نے انسان کو اسٹیشن کی لادنگ پلکیوں پر لکھا دیا تھا۔ بادشاہ اور ملکہ سے پروٹوکول شروع ہوتا تھا اور وائرسے تک آتا تھا اور وائرسے سے اُس کی کونسل کے ارکان تک جاتا تھا۔ وہاں سے سر کے خطاب حاصل کرنے والے لوگوں تک آتا تھا اور وہاں سے ہوتے ہوئے سفید پوشوں اور کرسی نشینوں تک جاتا تھا۔ یہ جس شخص کو وفاداری اور حب الوطنی کا پروانہ جاری کرتے تھے صرف وہی شخص وفادار اور حب الوطن ہوتا تھا۔ باقی تمام مشکوک سمجھے جاتے تھے اور انھیں اس شک کی بنیاد پر کسی بھی وقت گرفتار کیا جاسکتا تھا۔ گولی ماری جاسکتی تھی۔ سرکار کے ظلم کی حالت یہ تھی کہ بریگیڈ یز جزل ڈائر نے 13 اپریل 1919ء کو امرتر کے جلیانوالہ باغ میں گولی چلا کر 370 لوگ قتل کر دیئے اور کوئی شخص اس کا ہاتھ نہ روک سکا۔ کیوں؟

کیونکہ جزل ڈائر کو ملکہ کے عنایت کردہ اختیارات کے مطابق گولی چلانے کا اختیار حاصل تھا۔ چنانچہ اس نے یہ اختیار استعمال کیا اور سرکار نے عوامی رد عمل کے بعد جزل ڈائر کو بطور سزا لدن و اپس بھجوادیا اور یہ سزا 370 لوگوں کے قتل کی سزا تھی۔ یہ وہ پروٹوکول اور یہ وہ بے لگام اختیارات تھے جنہوں نے برطانیہ کے نہ ڈوبنے والے سورج کو تاریخ کے سیاہ سمندر میں ڈکی دے کر بجھا دیا۔ برطانیہ نے تاریخ کے اس خوفناک زوال کے بعد چار بڑے فیصلے کیے۔ پہلا فیصلہ پروٹوکول کا خاتمه تھا۔ برطانیہ نے لوگوں کے درجے ختم کر دیئے۔ آج برطانیہ میں شاہی خاندان موجود ہے لیکن ان کی شہنشاہیت صرف محل تک محدود ہے۔ یہ لوگ جوں ہی محل سے باہر آتے ہیں۔ عام برطانوی لوگوں اور ان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ انھیں بھی سڑک پر روکا جاتا ہے۔ ان کا بھی چالان ہوتا ہے اور انھیں بھی عدالت میں پیش ہونا پڑتا ہے۔ وزیر اعظم اور ڈائر کی طرح سڑک پر پھرتے ہیں، یہ عام ٹرینیوں اور بسوں میں سفر کرتے ہیں، عام جہازوں کی اکانومی کلاس میں سوار ہوتے ہیں۔ برطانیہ کے وزراء اعظم گذشتہ 282 سال سے تین بیٹر روم کے گھر 10-ڈائریکٹریٹ میں رہ رہے

ہیں۔ ملک کے کسی وزیر اعظم کو 282 سالوں میں کوئی بڑی رہائش گاہ نصیب نہیں ہوئی۔ شاہی خاندان کے پاس درجنوں محلات تھے۔ ہر محل کے اندر ہزار ہزار ایکٹر کا باغ تھا۔ لیکن پھر یہ تمام باغ عوامی پارک بنادیے گئے۔ اسی فیضِ محلات بھی آج میوزیم ہیں اور سیاح روزانہ ان کی سیر کرتے ہیں۔ ملک میں آرمی چیف ہو پولیس چیف ہو یا چیف جسٹس ہو، کسی کوئی پروٹوکول حاصل نہیں۔ یہ لوگ اپنے دفاتر کے باہر عام شہری ہیں۔ * دوسرا فیصلہ قانون کی حکمرانی تھا۔ برطانیہ میں کوئی شخص قانون سے مضبوط اور بالاتر نہیں۔ برطانیہ نے فیصلہ کیا ہمارے ملک میں قانون مضبوط ہو گا اور کوئی عہدہ یا کوئی شخصیت اس سے بالاتر نہیں ہو گی۔

* تیسرا فیصلہ جمہوریت تھا۔ ملک کے تمام اختیارات کا ماحذع عوام ہیں۔ عوام پارٹی یا شخصیت کو مینڈیٹ دیتے ہیں۔ اور کسی شخص یا عہدہ یدار کو یہ مینڈیٹ چوری کرنے کا حق نہیں، ملک میں جعلی ووٹ یا دھاندی کا کوئی الزام نہیں رکھا۔

* چوتھا اور آخری فیصلہ لیڈر شپ تھا۔ یہ لوگ صرف اس شخص کو حق حکمرانی دیتے ہیں جو ذہنی، تعلیمی، اخلاقی اور جسمانی لحاظ سے شاندار ہوتا ہے۔ ان کے کسی سیاستدان پر ادا، ضد یا ہبہ دھرمی یا نقل، جعلی ڈگری یا بے ایمانی، چوری، ٹیکس چوری، جھوٹ یا کسی بڑی بیماری کا ایزادام لگ جائے تو اس کا سیاسی کیریئر ختم ہو جاتا ہے، یہ سیاست کے ایوانوں سے فارغ ہو جاتا ہے۔ یہ وہ چار فیصلے ہیں۔ جن کی وجہ سے تاریخ برطانیہ صرف برطانیہ بننے کے باوجود دنیا کی پانچویں بڑی طاقت ہے اور دنیا بھر کے حکمران برطانیہ کے وزیر اعظم اور ملکہ سے ہاتھ ملانا اعزاز سمجھتے ہیں۔ میں نے اکثر اپنے ملک کے مختلف ادوار کے وزیر اعظم اور وزراء کو 10-ڈائریکٹریٹ میں برطانوی وزیر اعظم کے گھر کے دروازے پر کھڑا دیکھا۔ برطانوی وزیر اعظم نے باہر نکل کر استقبال کیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے اپنے ہاتھ سے دروازہ کھولا اور ہمارے وزیر اعظم کو اندر لے کر گئے۔ کیا ہمارے وزیر اعظم نے اس منظر سے کچھ سیکھا؟*

میرا خیال ہے نہیں سیکھا ہو گا۔ کیونکہ ہمارے کسی حکمران نے آج تک ان مناظر سے کچھ نہیں سیکھا۔ یہ لوگ سیکھ سکتے تو آج ملک کی یہ حالت نہ ہوتی۔ یہ لوگ آج بھی جگنی کے اس پروٹوکول سے باہر نہیں آئے۔ جس کو برطانیہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد مکمل طور پر ترک کر دیا تھا۔ ہمارے ملک میں آج بھی گرسی نشین اور سفید پوش موجود ہیں۔ پوری ریاست انھیں سیلوٹ کرتی ہے۔ اور یہ لوگ جب تک سسٹم کا حصہ رہیں گے، ہم اس وقت تک زوال کے عذاب سے نہیں نکل سکیں گے۔ میرا دعویٰ ہے کہ ہمارا وزیر اعظم جب تک 10 ڈائریکٹریٹ میں پیش ہونا پڑتا ہے۔ وزیر اعظم ہوتا اور یہ اپنے ہاتھ سے دروازے نہیں کھولتا، ہم اس وقت تک جگنی کے دوڑ میں زندہ رہیں گے۔ ہم پر اس وقت تک اس بیوی کی حکومت رہے گی جس نے برطانیہ یعنی سلطنت کو تباہ کر دیا تھا۔ (بٹکریہ بی بی سی)



سراج الدولہ: وہ شخص جس کے وحشیانہ قتل کے بعد ہندوستان

پر انگریزوں نے 180 سال تک راج کیا

کلائیو کو ذاتی طور پر 34 ہزار پاؤنڈ کی رقم ملنے جا رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس جا گیر نکلے اور طلوع آفتاب کے ساتھ ہی مرشد آباد پہنچے۔ اگلے ہی دن رابرٹ کلائیو نے میر جعفر کو ایک نوٹ بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ میں آپ کو اس فتح پر مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ فتح میری نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کونواب بنانے کا اعلان کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوگا۔ اس سے پہلے صحیح سورے گھبر اہٹ اور تھکاوٹ کا شکار لگنے والے میر جعفر برطانوی کیپ میں اپنی موجودگی درج کر رہے تھے تو برطانوی فوجی انھیں کرمل کلائیو کے خیمے میں لے گئے۔ کلائیو نے میر جعفر کو مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر دارالحکومت باشتنے کے لیے بیٹھنے گئے ہیں۔

سراج الدولہ صبح تین بجے چھپ کر بھاگ گئے

جب کلائیو اس لوٹ مار میں سے اپنا حصہ لینے کے منتظر تھے تو میر جعفر کے بیٹے میران نے سراج الدولہ کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جو بیگانے کے دارالحکومت سے فرار ہو چکے تھے۔ مشہور مورخ سید غلام حسین خان نے اپنی فارسی زبان میں لکھی گئی کتاب 'سیار المتأخر' میں لکھا ہے کہ 'سراج الدولہ عام لوگوں کا لباس پہن کر بھاگے تھے۔ اس کے ہمراہ ان کے قریبی رشتہ دار اور بعض خواجہ سرا بھی تھے۔ صبح تین بجے انہوں نے اپنی الہیہ لطف النساء اور بعض قریبی رشتہ داروں کو احاطہ دار گاڑیوں میں بیٹھا دیا، جتنا سونا اور زیورات اپنے ساتھ لے سکے اپنے ساتھ لے گئے اور محل چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ وہ پہلے بھاگوان گولہ گئے اور پھر دو دن بعد کئی کشتیاں بدلت کر محل کے کنارے پر پہنچے۔ یہاں وہ کچھ کھانا کھانے کے لیے ٹھہرے۔ انہوں نے کھجڑی بنوائی، وہ اس لیے کی کہ انہوں نے اور ان کے ساتھ سفر کرنے والے لوگوں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

فقیر کی مجری اور گرفتاری

اسی علاقے کے ایک فقیر شاہ داتا نے مجری کرتے ہوئے سراج الدولہ کے دشمنوں کو اُن کے وہاں پہنچنے کی خبر دے دی۔ وہ دشمن جو انھیں ڈھونڈنے کے لیے دن رات ایک تھے۔ مشہور مورخ ولیم ڈارلمپل اپنی کتاب 'انارکی' میں لکھتے ہیں کہ 'اس فتح کے لیے

23 جون 1757 کو پلاسی کی جنگ ہارنے کے بعد سراج الدولہ اونٹ پر بھاگ نکلے اور طلوع آفتاب کے ساتھ ہی مرشد آباد پہنچے۔ اگلے ہی دن رابرٹ کلائیو نے میر جعفر کو ایک نوٹ بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ میں آپ کو اس فتح پر مبارکباد دیتا ہوں۔ یہ فتح میری نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کونواب بنانے کا اعلان کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوگا۔ اس سے پہلے صحیح سورے گھبر اہٹ اور تھکاوٹ کا شکار لگنے والے میر جعفر برطانوی کیپ میں اپنی موجودگی درج کر رہے تھے تو برطانوی فوجی انھیں کرمل کلائیو کے خیمے میں لے گئے۔ کلائیو نے میر جعفر کو مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر دارالحکومت میں لے گئے۔ میر جعفر کو مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر دارالحکومت میں اپنے ساتھ آباد کی طرف کوچ کر جائیں اور اس پر قبضہ کر لیں۔ انہوں نے آگاہ کیا کہ میر جعفر کے ساتھ ان کے کرمل واٹس بھی جائیں گے۔ کلائیو مرکزی فوج کے ساتھ ان کے پہنچپے آگئے اور انھیں مرشد آباد تک پہنچنے میں تین دن لگے۔ راستے میں سڑکوں پر چھوڑی گئی تو پہلی، ٹوٹی ہوئی گاڑیاں اور سراج الدولہ کے سپاہیوں اور گھوڑوں کی لاشیں میں۔ سر پینڈرل مون اپنی کتاب 'دابرلش کونویسٹ اینڈ ڈیمینن ان انڈیا' میں لکھتے ہیں کہ 'اگرچہ کلائیو کو 27 جون کو مرشد آباد پہنچنا تھا لیکن جگت سیٹھ نے انھیں متبنہ کیا کہ ان کو مارنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے، لہذا 29 جون کو کلائیو شہر میں داخل ہوئے۔ میر جعفر نے شہر کے اہم داخلی دروازے پر ان کا استقبال کیا۔ یہ رابرٹ کلائیو ہی تھے جنہوں نے میر جعفر کو تخت پر بٹھایا اور انھیں سلامی دی۔ پھر انہوں نے اعلان کیا کہ کمپنی میر جعفر کے اقتدار میں کسی بھی طرح مداخلت نہیں کرے گی اور صرف تجارتی معاملات پر نگاہ رکھے گی۔ انگریزوں نے اس جنگ کے 180 سال بعد تک یکطرفہ طور پر ہندوستان پر حکمرانی جاری رکھی۔

کلائیو توں رات یورپ کے امیر تین شخص بن گئے

کلائیو کو سراج الدولہ کے خزانے سے پانچ کروڑ روپے ملے جو ان کی توقع سے کم کر رہے تھے۔ یہ خبر ملتے ہی میر جعفر کے داماد میر قاسم نے دریا یا گور کیا اور سراج الدولہ

جانے۔ رابرٹ اور مے لکھتے ہیں کہ 'پھر تھی اچانک محمد بیگ نے سراج الدولہ پر خیز
سے حملہ کیا۔ جیسے ہی خیز نے اپنا کام کیا دوسروں نے اپنی تلواریں سونت لیں اور وہ
سراج الدولہ پر پل پڑے، وہ منہ کے بل گر پڑے'۔

لاش کو ہاتھی پر رکھ کر گھما یا گیا

اگلے دن سراج الدولہ کی مسخ شدہ لاش کو ہاتھی کی کمر پر لاد دیا گیا اور مرشد آباد کی
گلیوں اور بازاروں میں گھومایا گیا۔ یہ ان کی شکست کا سب سے بڑا ثبوت تھا۔ سید غلام
حسین خان اس بربریت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ 'اس درندگی کے سفر کے
دوران اس ہاتھی کے مہاوت نے جان بوجھ کر حسین قلی خان کے گھر کے سامنے ہاتھی کو
روکا۔ دو سال قبل اسی حسین قلی خان کو سراج الدولہ نے قتل کروادیا تھا۔ یہاں پر سراج
دولہ کی لاش سے خون کے کچھ قطرے اسی جگہ گرے جہاں قلی خان کا قتل کیا گیا تھا'۔

لف النساء کا میر جعفر سے شادی سے انکار

کرم علی نے 'دامظفر ناما آف کرم علی' میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'تقریباً
70 بے گناہ بیگموں کو ایک کشتی میں بیٹھا کر دریائے ہوگی کے وسط میں لے جایا گیا تھا
اور کشتی کو وہاں ڈبو دیا گیا۔ سراج الدولہ خاندان کی باقی خواتین کو زہر دے کر ہلاک کر
دیا گیا۔ انھیں زیر آب مار دی جانے والی خواتین کے ساتھ دریائے ہنگلی کے قریب ہی
خوش باغ نامی باغ میں دفن کر دیا گیا۔ صرف ایک عورت کی جان بخشنی گئی۔ یہ سراج
دولہ کی بہت خوبصورت الہمیہ تھیں۔ میران اور اس کے والد میر جعفر دونوں نے انھیں
شادی کا پیغام بھیجا۔

میر جعفر کا زوال

پلاسی کی جنگ جیتنے کے ایک سال کے اندر ہی میر جعفر کا جلوہ کم ہونے لگا۔ کچھ عرصہ
قبل تک میر جعفر کی وکالت کرنے والے کلائیونے انھیں 'دی او لڈ فول'، یعنی بیوقوف
بوزھا اور ان کے بیٹے میران کو 'ڈاور تھل' لیں یہ ڈاگ، یعنی ایک بیکار نوجوان کا تقرار
دیا۔ سستی، ناہلی اور افیون نے میر جعفر کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ 11 نومبر 1758 کو
کلائیونے جان پین کو ایک خط لکھ کر کہا تھا جس شخص کو ہم نے تخت پر بٹھایا وہ مغرور،
لاچی اور بات بات پر گالی دینے والا شخص بن گیا ہے۔ اپنے اس رویہ کی وجہ سے وہ
اپنے عوام کے دلوں سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ کلائیونے کے انگلینڈ واپس آنے سے پہلے میر
جعفر اپنی فونج کے 13 ماہ کے باقی کراچی کی صرف تین قسطیں ہی ادا کر پائے تھے۔
تیخواہ نہ ملنے کی وجہ سے ان کے فوجی بغوات کے موڑ میں آگئے تھے۔ سرپنیڈرل مون
اپنی کتاب 'وارین پسٹنگس اینڈ برٹش انڈیا' میں لکھتے ہیں کہ 'میر جعفر کے فوجیوں کی
گھوڑے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکے تھے۔ ان پر سواری کرنے والے ان سے تھوڑے
سے ہی بہتر تھے۔ یہاں تک کہ اس کے افسر بھی پھٹے پرانے کپڑے پہن رہے
تھے۔ پلاسی کی لڑائی کے تین سال کے اندر ہی اندر انڈیا کے سب سے امیر شہروں میں

کو اپنے مسلح افراد کے ساتھ گھیر لیا۔ سراج الدولہ کو 2 جولائی 1757 کو گرفتار کر کے
مرشد آباد لایا گیا۔ اس وقت رابرٹ کلائیور شد آباد میں موجود تھے۔ وہاں پہنچنے سے
پہلے ہی انھوں نے فورٹ ولیم میں اپنے ساتھیوں کو خط لکھ دیے تھے۔ اس میں سے ایک
خط میں انھوں نے لکھا کہ 'مجھے امید ہے کہ میر جعفر نواب کو تخت سے ہٹائے گئے نواب
کے ساتھ اسی محبت کا اٹھا کر میں گے جو ان حالات میں ممکن ہے۔' دو دن بعد انھوں نے
ایک اور خط لکھا جس میں انھوں نے کہا کہ 'سراج الدولہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔
نواب میر جعفر نے شاید ان کو بچالیا ہوتا لیکن ان کے بیٹے میران نے سوچا کہ ملک میں
امن کے لیے سراج الدولہ کو مرنا ہو گا۔ انھیں کل صبح خوش باغ میں سپرد خاک کر دیا
گیا۔' اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے رابرٹ اور مے نے اپنی کتاب 'ہسٹری آف
ملٹری ٹرائز' میں آف دی برٹش نیشن ان ہندوستان، میں لکھتے ہیں کہ 'تخت بدر نواب کو
آدمی رات کو اسی محل میں میر جعفر کے سامنے پیش کیا گیا تھا جس میں کچھ دن پہلے تک وہ
رہا کرتے تھے۔ سراج نے میر جعفر کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے، کاپنے ہوئے اپنی
جان کی امان مانگی۔ اس کے بعد سپاہی ان کو محل کے ایک دوسرے کونے میں لے
گئے۔ اسی دوران میر جعفر اپنے درباریوں اور اہلکاروں سے یہ مشورہ کرتے رہے کہ
سراج الدولہ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اس کے پاس تین تبادل راستے تھے۔ یا تو
سراج الدولہ کو مرشد آباد میں قید کر دیا جائے یا ملک سے باہر قید کیا جائے یا پھر انھیں
سزاۓ موت دے دی جائے۔ بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ سراج کو جیل میں زندہ رکھنا
چاہیے۔ لیکن میر جعفر کا 17 سالہ بیٹا میران اس کے سخت خلاف تھا۔ اس پورے
معاملے میں جعفر کی اپنی نہ تو کوئی رائے تھی اور نہ ہی کوئی دخل۔ حال ہی میں شائع ہونے
والی کتاب 'پلاسی دا بیٹل': دیٹ چینجڈ دا کورس آف انڈین ہسٹری' کے مصنف سدیپ
چکرورتی لکھتے ہیں کہ 'میران نے اپنے والد کی خاموشی کو ان کی رضامندی سمجھا۔ اس
نے اپنے والد سے کہا کہ آپ آرام کریں، میں ان کو سنچال لوں گا۔' میر جعفر نے سمجھا
کہ کوئی تشدید نہیں ہو گا۔ انھوں نے دیرات تک لگنے والے اپنے دربار کو بند کیا اور اپنے
کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔

تلواروں اور خیزوں سے مارا گیا

سید غلام حسین خان لکھتے ہیں کہ 'میران نے اپنے ایک ساتھی محمد بیگ، جس کا دوسرا
نام لال محمد بھی تھا، کو سراج الدولہ کو مارنے کا حکم دیا۔ جب میران اپنے ساتھیوں کے
ساتھ سراج الدولہ کے پاس پہنچا تو سراج کو اندازہ ہوا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا
ہے۔ اس نے اجاتا کی کہ اسے مارنے سے پہلے اسے وضو کرنے اور نماز پڑھنے کی
اجازت دی جائے۔ اپنا کام جلد ختم کرنے کے لیے قاتلوں نے سراج کے سر پر پانی
سے بھرا برتن اونڈیل دیا۔ جب سراج الدولہ کو احساس ہوا کہ انھیں سکون سے وضو نہیں
کرنے دیا جائے گا تو انھوں نے کہا کہ اسے پیاس بجھانے کے لیے پانی پلایا

قارئین کے لیے خوشخبری

آپکی پسندیدگی اور نیک تھناوں کی بدولت ماہنامہ لاہور اٹر نیشنل اپنی ترقی کی منازل کی طرف رواں دوالی ہے۔ جنوری 2018ء سے ادارہ لاہور اٹر نیشنل نے قارئین کے لیے ایک نئی ویب سائٹ تشکیل دی ہے۔ وجود یہ تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اسکا URL درج ذیل ہے

www.lahoreinternational.com

قارئین کرام اس ویب سائٹ پر اہم خبریں، مضامین اور دیگر شعبہ جات سے متعلق موثر مضامین اور عالمی خبریں بھی ملاحظہ فرماسکتے ہیں۔ آپ کی تجویز اور تبصروں کی روشنی میں اس سائٹ کو مزید سے مزید بہتر بنانے کیلئے "ادارہ " پر عزم ہے۔

ویب سائنس پر اردو اور انگریزی دو نوں رسالے اور مواد موجود ہے۔ تمام دنیا میں یہ رسالہ اب ماشاء اللہ لاکھوں کی تعداد میں قارئین کے زیر مطالعہ ہے۔ جس قلیل مدت میں قارئین نے اس رسالہ کو پسند کیا ہے اس کیلئے ہم تمام قارئین کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ دنیاۓ صحافت میں آپ کی قدردانی سے رسالہ نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ قابل تائش ہے۔

اب ہماری کوشش ہے کہ اسکو جلد از جلد ”ہفتہ وار“ کر دیا جائے اور آپ دوستوں کی دعاؤں کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

(اداره لاهور انٹر نیشنل)

لاراٹریشنل رسالہ کی

توسیع اشاعت میں حصہ لینا

آپ کا قومی فرض ہے۔

ایک مرشد آباد غربی کی دلیلیز پر آن کھڑا ہوا تھا۔

میر جعفر نے بنگال کو بر باد کر دیا

اس بربادی کے لیے بہت حد تک خود میر جعفر ذمہ دار تھے۔ غلام حسین خان لکھتے ہیں کہ میر جعفر ہمیشہ مہنگے جواہرات پہننا پسند کرتے تھے۔ لیکن نواب بننے ہی انہوں نے ایک ہی کلائی میں مختلف جواہرات سے بنی چھ، سات بریسلیٹ پہننا شروع کر دیں۔ اس کے گلے میں تین چارڑیوں کی مالا لکلی رہتی تھی۔ اس کا سارا وقت موسیقی سننے اور خواتین کا رقص دیکھنے میں صرف ہوتا تھا، کچھ ہی دن میں یہ واضح ہو گیا تھا کہ میر جعفر میں بنگال پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ ایک ان پڑھ عرب سپاہی کی طرح تھے جن کا راج پاٹ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ سرپنڈرل اپنی کتاب 'دابرلش کونکویسٹ اینڈ ڈومینی恩 آف انڈیا' میں لکھتے ہیں کہ 'کلائیو نے خود انگلینڈ جانے والے جہاز پر سوار ہونے سے پہلے کہا تھا کہ میر جعفر میں حکمرانی کا دم نہیں ہے۔ ان میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اپنے لوگوں کی محبت اور ان کا اعتماد حاصل کر سکیں۔ ان کے بدانتظامی نے بنگال کو انتشار کی طرف دھکیل دیا ہے۔

میران نے 300 سے زائد افراد کی جان لی

دوسری جانب ان کے بیٹے میران کا ہمدردی اور حمدی سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ ان کی سب سے بڑی تشویش یہ تھی کہ کیسے علی وردی خان کے بقیہ کنے کو ختم کیا جائے تاکہ مستقبل میں بغاوت کے امکان کو ختم کیا جاسکے۔ غلام حسین خان لکھتے ہیں کہ علی وردی خان کے پورے حرم کو دریا میں ڈبوئے کے بعد اس کی توجہ سراج الدولہ کے پانچ قریبی رشتہداروں پر مکوز ہو گئی۔ اس نے سراج الدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا مہدی کو لکڑی کے دوختنوں کے درمیان رکھ کر پسوا دیا۔ بعد میں میران نے اس قتل کو سعدی کی کہاوت کو دھراتے ہوئے جائز قرار دیا کہ سانپ کو مارنے کے بعد اس کے پنج کو چھوڑنا کوئی داشمندانہ بات نہیں ہے۔ دوسرے حریفوں اور سابق انتظامیہ کے اہم الہکاروں کو میران نے دربار کے اہم دروازے پر اپنے ہاتھوں سے چھرا گھونپ کر ہلاک کیا یا انھیں زہر پلوادیا۔ غلام حسین خان نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ میران سراج الدولہ کے خاندان کے مارے گئے لوگوں کی ایک فہرست رکھتا تھا اور اسے ایک خاص نوٹ بک میں اپنی جیب میں رکھتا تھا۔ جلد ہی اس فہرست میں مرنے والوں کی تعداد 300 ہو گئی، جب وارن پیسٹنگ نے سراج خاندان کے لوگوں کے قتل کے بارے میں سناتو اس نے ملکتہ بھیجی جانے والی اپنی رپورٹ میں لکھا کہ کوئی بھی دلیل اس ولن کے کرتوتوں پر پرداہ نہیں ڈال سکتی ہے۔ مجھے یہ کہنے کے لیے معاف کیا جائے کہ ایسے شخص کی ہماری حمایت کسی بھی طرح سے جائز نہیں ہو سکتی؛ (بشعکر یہ بی بی سی)



وادی گالوان *ایک رچسپ معلومات*

(لاہور انٹرنیشنل نیوزڈیسک)

وادی ماحول سے حفاظت کے لیے مناسب کپڑے نہ پہنے جائیں تو کھلی فضا میں دس منٹ گزار نے پر کوئی بھی شخص ہائپو تھر میا کا شکار ہو سکتا ہے۔ غلام رسول گالوان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بت، سنیانگ، قراقرم، پامیر اور دوسرا وسط ایشیائی علاقوں میں خوب سفر کیا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے مشہور کوہ پیا کے گانجید کا کام کیا۔ وادی گالوان دشوار گزار علاقہ ہے اور سردیوں میں درجہ حرارت منفی 30 ڈگری تک گر جاتا ہے۔ برطانوی ماہر ارضیات میجر ایچ ایچ گودون آسٹن کے ساتھ بھی انھوں نے سفر کیا۔ یہ دشیخت ہیں جنھوں نے پاکستان کی بلند ترین اور دنیا کی دوسرا بلند ترین چوٹی کے ٹوکی پیانش کی تھی۔ اس کی بلندی آٹھ ہزار 611 میٹر ہے لیکن بعض کوہ پیاواں کے مطابق اس پر چوتھا دنیا کی بلند ترین چوٹی ایوریسٹ سر کرنے سے مشکل ہے۔ غلام رسول گالوان جب 12 سال کے تھے اسی وقت سے انھوں نے بڑی سفری مہماں میں شرکت شروع کر دی تھی۔ 1890 میں انھوں نے کیپن بینگشینڈ کے ساتھ یارک لینڈ کا سفر کیا تھا جو کہ اب چین کے سنیانگ کے صوبے میں واقع ہے اور اسی کے ساتھ ان کے سفری مہماں کا آغاز ہوتا ہے۔ 1899 کی مہم کے دوران انھوں نے جس دریا کو دریافت کیا تھا اس دریا کو ان کا نام دے دیا گیا۔ گالوان کو چینی زبان اور انگریزی زبان کا قدرے علم تھا جس کی وجہ سے انھوں نے بطور خاص برطانوی مہم جوؤں کی اس خطے میں رہنمائی کی۔ دشوار گزار پہاڑی علاقے میں پینگونگ نامی جھیل بھی ہے جو سردیوں میں بند رہتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعد میں گالوان برش جوانہ کمشنر کے مقامی نائب سربراہ مقرر کیے گئے اور وہ بتت سے اس علاقے کے ذریعے سامان کے لفڑ وحمل کے ذمہ دار ٹھہرے۔ گزشتہ چند برسوں میں چین نے اس علاقے میں بہت سی تغیرات کی ہیں اور شہراہ ریشم یعنی سلک روڈ کے ساتھ اس راستے کو بھی تروغ دینے کا کام کیا ہے۔ دوسرا جانب انڈیا نے بھی نقل حمل کے لیے گالوانے کے علاقے میں سڑکوں کی تعمیر کی ہے یہ بدل گئی ہے۔ دونوں ملکوں کی جانب سے علاقے میں تغیرات اور ترقیاتی کاموں کی وجہ سے اب علاقے میں حد بندی کی تنازع پیدا ہوا ہے جس کی وجہ سے وادی گالوان شہر سرخیوں میں ہے۔ (انتخاب)

الله رب العزت کی قدرت کو دیکھیے جس گالوان گھاٹی کے لیے چین اور ہندوستان میں جھگڑا ہے۔ اسی گھاٹی کی کھوج غلام رسول گالوان نام کے چروں ہے نے کی تھی اور ہندوستان کا کہنا ہے کہ ”غلام رسول گالوان ہندوستانی تھا۔۔۔ اس لیے وہ گھاٹی ہندوستان کی ہے“ چین کہتا ہے کہ ”اگر غلام رسول گالوان ہندوستانی ہے تو ثابت کرو اور ہمیں کاغذ دکھاؤ“ جو لوگ کچھ دن پہلے 20 کروڑ مسلمانوں سے کاغذ ڈھونڈنے کو کہے رہے تھے۔ آج وہ ایک مسلمان کے کاغذ تلاش کر رہے ہے۔ اور اللہ تمہاری سازشوں کو تمہارے ہی منہ پر مار دیتا ہے۔ دنیا بھر میں دریاؤں کے نام پر بچوں کا نام رکھنے کا رواج ہے۔ انڈیا میں گنگا، جمنا، کاویری، گوداواری، سرسوتی جیسے نام عام ہیں اور یہ سب انڈیا میں بڑے دریاؤں کے نام ہیں۔ لیکن ان دنوں ایک دریا کا دنیا بھر میں بہت ذکر ہے اور وہ دریائے گالوان ہے جہاں کی وادی میں گزشتہ ایک ماہ سے انڈیا اور چین کے درمیان کشیدگی برقرار ہے اور گزشتہ دنوں یعنی سوموار اور منگل کی درمیانی رات کو دنوں ممالک کے فوجیوں کے درمیان تصادم میں کم از کم 20 انڈیا جوان ہلاک ہو گئے۔ گالوان اگرچہ تنازع کا باعث بنا ہوا لیکن اس علاقے اور دریا کا نام لداخ کے ایک سخت جان قلی غلام رسول گالوان کے نام پر ہے۔ گالوان دریا قراقرم کے پہاڑی سلسلے سے نکلتا ہے اور چین سے ہوتے ہوئے لداخ میں شیوک دریا میں شامل ہو کر شیر دریا یعنی دریائے سندھ میں شامل ہو جاتا ہے۔ دریائے گالوان تقریباً 80 کلومیٹر طویل ہے اور اس خطے میں اس کی عسکری اہمیت بہت زیادہ ہے۔ 2001 میں شائع ہونے والی کتاب ”سردینیس اور صاحبوں“ میں انگریزوں کے ایک خاص ملازم غلام رسول گالوان کا ذکر ہے جن کے نام پر لداخ کے شمال مشرقی علاقے کا نام پڑا۔ کتاب کے مطابق غلام رسول گالوان سنہ 1878 میں پیدا ہوئے اور انھوں نے مختلف یورپی سیاحوں یعنی ”صاحبان“ کے ساتھ اس دور دراز مشکل اور سلگاخ علاقے کا سفر کیا۔ یہ سفر اس لیے بھی انتہائی مشکل ہوا کرتا تھا کیونکہ وہ ایسا علاقہ تھا جہاں نہ آدم نہ آدم زادبیس، پہاڑ، پتھر، دریا اور جنگل۔ سطح سمندر سے اس علاقے کی بلندی پانچ ہزار سے سات ہزار فیٹ تک ہے جہاں گرمیوں میں بھی بعض مقامات پر درجہ حرارت منفی میں ریکارڈ کیا جا چکا ہے۔ جاڑوں میں درجہ حرارت منفی 30 ڈگری تک چلا جاتا ہے۔ اگرچہ بستہ ہوا اور مجدد کرنے



خاطر شکن ہیں اب تو مضمون میں اختلاف



تحریر: ڈاکٹر طارق احمد مرزا۔ آسٹریلیا

دیتے۔ چنانچہ باخبر ذراائع کے مطابق 16 فروری 2020 کو پرمیم کورٹ کے جلس میں ولی وائی چندر چوڑ نے ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اختلاف کو جمہوریت کا سیفی والوں قرار دیتے ہوئے کہا کہ ”اختلاف کو ایک سرے سے ملک مختلف اور جمہوریت مختلف بتا دینا آئینی اقدار کے تحفظ اور ڈائیلاگ پر منی جمہوریت کو فروع دینے کے تین ملک کے بنیادی خیال پر ضرب لگاتا ہے۔ جسٹس چندر چوڑ نے دو ٹوکرے کہا کہ آئین سازوں نے ہندو بھارت یا مسلم بھارت کے خیال کو سرے سے ہی مسترد کر دیا تھا۔ انہوں نے صرف ہندوستانی جمہوریت کو تسلیم کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ افکار کو دنیا ملکی ضمیر کو دنیا ہے۔ ان کا یہ حقیقت پسندانہ بیان ایک ایسے وقت میں سامنے آیا جب شہریت ترمیمی قانون (سی اے اے) اور قومی آبادی رجسٹر (این پی آر) اور قومی شہریت رجسٹر (این آر سی) کے خلاف ملک کے تمام حصوں میں بڑے الگ نظریات و عقائد کے بارہ میں انسان کو خود اپنی عقل اور فکر سے کام لینے کا موقع دیا گیا ہے۔ یہاں بھی ساتھ یہ ارشاد فرمایا کہ تم جو بھی راستہ اپنے لئے اختیار کرو، مطمئن انتظار غرض یہ ہونی چاہئے کہ نیکیوں میں سبقت اختیار کرو۔ باقی جو اختلافات ہیں تو ان کے بارہ میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں ان کی حقیقت سے مطلع فرمادے۔

جسٹس چندر چوڑ نے یہ کہا کہ اختلاف کا تحفظ کرنا یہ یادداشتا ہے کہ جمہوری طور پر ایک منتخب حکومت ہمیں ترقی اور سماجی رابطوں کے لئے ایک جواز فراہم کر رہی ہے، وہ ان اقدار اور شناخت پر کبھی اجارہ داری کا دعویٰ نہیں کر سکتی جو ہماری تکشیری معاشرے کو بیان کرتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اختلاف روکنے کے لئے سرکاری مشینری کو استعمال کرنا خوف پیدا کرتا ہے اور آزادانہ امن پر ایک ڈرائی ناما جوں پیدا کرتا ہے جو قانون کی بالادستی کی خلاف ہے۔ انہوں نے کہا کہ سوال کرنے کی گنجائش کو ختم کرنا اور اختلاف کو دنیا تمام طرح کی پیش رفت سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی بنیاد کو متزلزل کرتا ہے، کیوں کہ اختلاف جمہوریت کی روح ہے اور اس کے لیے ”سیفی والوں“ ہے۔ جسٹس چندر چوڑ نے یہ بھی کہا کہ اختلاف کو خاموش کرنا اور لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا ہونا انفرادی آزادی کی خلاف ورزی ہے۔ غور طلب ہے کہ جسٹس چندر چوڑ اس بخش کا حصہ تھے، جس بخش نے یوپی میں اے اے کے خلاف مظاہروں کے دوران عوامی املاک کو نقصان پہنچانے والوں سے معاوضہ وصول کرنے کے ضلع انتظامیہ کی طرف سے مبینہ مظاہروں کو بھیجنی گئی نوٹس پر جنوری میں

اختلاف ایک ایسی چیز ہے جس سے پوری کائنات کا حسن قائم ہے۔ عالم انسانی کا بھی یہی معاملہ ہے۔ رنگ، ناک، نقشہ، نسل، زبان، نظریات، افکار اور سوچ کا اختلاف یعنی نوع عالم انسانیت کو اس کا حسن عطا کرتے ہیں۔ اور یہ امر ربی یا حکمت الہی کے تحت ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو ذاتوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ آپس میں پہچان اور تعارف میں آسانی ہو (الجرات)، اور بس۔ وگرنہ اس کے نزدیک زیادہ عزت والا تو وہی ہے جو تقویٰ میں آگے ہو۔ اسی طرح مذہبی دنیا کے بارہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ اگر اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی شریعت پر قائم کر دیتا (المائدہ) لیکن محض ایک آزمائش یا جانچ کی خاطر الگ اگل نظریات و عقائد کے بارہ میں انسان کو خود اپنی عقل اور فکر سے کام لینے کا موقع دیا گیا ہے۔ یہاں بھی ساتھ یہ ارشاد فرمایا کہ تم جو بھی راستہ اپنے لئے اختیار کرو، مطمئن انتظار اور غرض یہ ہونی چاہئے کہ نیکیوں میں سبقت اختیار کرو۔ باقی جو اختلافات ہیں تو ان کے بارہ میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں ان کی حقیقت سے مطلع فرمادے گا۔ گویا دنیا میں انسان کو ان اختلافات کے بارہ میں ”ٹینشن“ لینے کی چند امور ضرورت نہیں۔ لیکن افسوس کہ تہتر بررسوں میں وطن عزیز پاکستان میں جس طرح کے سماجی رویوں کو پروان چڑھایا گیا اس نے ایک ایسی عدم برداشت کے ماحول کو جنم دے ڈالا ہے جہاں اختلاف رائے کو قابل مواجهہ جرم سمجھا جانے لگ گیا ہے۔ یہ رویہ سیاسی، مذہبی، جمہوری، تعلیمی، معاشرتی، نظریاتی، قانونی، حکومتی، غرض زندگی کے ہر شعبہ کو اپنی آگ کی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ اختلاف رائے کو کہیں اکثریت کے جبر، انتہا پسندی، ہجومی تشدد کے ذریعہ بنے کی کوشش کی جاتی ہے تو کبھی بنیادی انسانی حقوق کے منافی قوانین بناتا کر۔ اور یہ سب کچھ جمہوریت کے نام پر کیا جاتا ہے۔ جبکہ پاکستانی جمہوریت بقول شخصی اس مقام پر پہنچ گئی ہے جس میں دو بھیڑیوں اور ایک بھیڑ کے درمیان ووٹنگ کروائی جاتی ہے کہ رات کا کھانا کیا ہونا چاہیے۔ پاکستانی سماج کے ان منفی معاشرتی اور نفسیاتی رحمانات کے مذہبی دل نے ہمسایہ ملک بھارت کو بھی اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا ہے لیکن وہاں کم از کم اتنا ضرور ہے کہ عدالتی کے چوٹی کے نج احتلاف کو جرم، ملک و آئین سے غداری یا توہین عدالت قرار نہیں

سعودی عرب: عدالیہ میں خواتین

تحقیقاتی افسران کی تعیناتی



سعودی عرب کے پبلک پر اسکیوٹر کی طرف سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ خواتین افسران کو متعدد مقدمات کی تحقیقات پر مامور کیا جائے گا۔

سعودی عرب کے فرمانروا شاہ سلمان بن عبدالعزیز کی ہدایت پر عدالیہ کے شعبے میں 53 خواتین تحقیقاتی افسران کی تعیناتی کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

العربیہ ڈاٹ نیٹ کے مطابق سعودی عرب کے پبلک پر اسکیوٹر کی طرف سے جاری ہونے والے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ خواتین افسران کو متعدد مقدمات کی تحقیقات پر مامور کیا جائے گا۔

بیان میں کہا گیا ہے کہ خواتین کی عدالیہ کے شعبے میں تعیناتی کا مقصد مملکت کے عظیم الشان اصلاحاتی پروگرام ویژن 2030 کے اہداف کا حصہ اور خواتین کو زیادہ با اختیار بنانے کی کوششوں کا تسلسل ہے۔ سعودی عرب کے پر اسکیوٹر جزل کے ترجمان ڈاکٹر ماجد الدسمانی نے بتایا کہ ویژن 2030 کے اہداف کے تحت پر اسکیوشن کے شعبے میں 50 سے زائد خواتین کو تعینات کیا گیا ہے۔

ترجمان کا کہنا تھا کہ سعودی عرب کے پر اسکیوشن شعبے کے زیر انتظام 156 مرد و خواتین ملازمین کی پیشہ وارانہ تربیت کا سلسلہ جاری ہے۔ جلد ہی انہیں ان کی اہم ذمہ داریوں پر تعینات کیا جائے گا۔

<https://www.sahilonline.net/ur/blanket-labelling-of-dissent-as-anti-national-hurts-ethos-of-democracy-justice-chandrachud>

اسی طرح سے بھارتی سپریم کورٹ کے جسٹس دیپک گپتا نے اظہار رائے اور غداری کے قانون کے موضوع پر احمد آباد میں تقریب سے خطاب ایک تقریب میں کہا تھا کہ عدالیہ پر تنقید تو ہیں عدالت نہیں اور نہ ہی مقدمة، عدالیہ مسلح افواج پر تنقید غداری کے زمرے میں آتا ہے، ان کا کہنا تھا کہ اگر ایسا کرنے لگ جائیں تو یہ تمام ادارے ریاست کی پولیس بن جائیں گے اور ان پر بات کرنے والا کوئی نہیں ہو گا، اگر تنقید مثبت ہو تو عدالیہ اور ریاست کے دیگر ادارے بھی اپنی خامیاں درست کر سکتے ہیں، تاہم ان کا زور تھا کہ عدالیہ تنقید سے مبرأ نہیں کئی فیصلے تنقید کے بعد درست ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا اگر عدالتیں تو ہیں عدالت پر مقدمات چلانا شروع کر دیں تو پھر عدالیہ میں کوئی کام ہی نہ ہو صرف تو ہیں عدالت کے مقدمات کی بھرمار ہو، انہوں نے بی جے پی کے لیئر اور ایک صحافی کے مقدمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ایک رپورٹ میں صحافی نے انتہائی غیر مہذب زبان استعمال کی دیگر قوانین کی تمام حدیں بھی توڑ دیں مگر یہ جرام کا ایک مقدمہ ضرور تھا مگر غداری کا بالکل نہیں۔ جسٹس دیپک گپتا نے دوڑک الفاظ میں کہا کہ اگر تنقید تمام قوانین اخلاقیات اور دیگر چیزوں کو منظر رکھتے ہوئے کی جائے تو یہ صحت مند معاشرے کے لئے اشد ضروری ہے، اس کے بغیر معاشرے میں شدید گھٹن پیدا ہو جائے گی، نہ تو سوچ کے نئے افق جنم لیں گے، نہیں سوچ اپناراست اختیار کرے گی نہ ہی نئی راہیں اور نئے راستے کھلیں۔ تنقید سوچ کو دوسرا رخ دکھانے کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

بحوالہ روزنامہ جنگ

<https://jang.com.pk/news/678263-topstory>
 انصاف پسند ذہنیت اور عادلانہ سوچ کا یہ نمونہ تولانے کے اس پار میئنے نئے پاکستان میں نظر آنا چاہیے تھا۔ لیکن افسوس، کہ بقول شاعر ۔

دلداریاں کہاں ہیں وہ سماں کبھی جو تھیں
 خاطر شکن ہیں اب تو مضامینِ اختلاف





آپا صوفیہ تاریخ کے آپنے میں تاریخی واقعات

صوفیہ کا چرچ یا آرتھوڈوکس کلیسیا کا عالمی مرکز تھا۔ (جہان دیدہ، مفتی تقی عثمانی)
مسیحی اہمیت:

مکتبہ فلسطینیہ (Constantinople) کھٹا آئے۔ (حوالہ مالا)

۲۰

قسطنطین نے اس جگہ 360ء میں ایک لکڑی کا بنا ہوا کلیسا تعمیر کیا تھا۔ چھٹی صدی میں یہ کلیسا جل گیا تو اسی جگہ قبصہ جسٹینین اول نے 532ء میں اسے پختہ تعمیر کرنا شروع کیا اور اس کی تعمیر پانچ سال دس مہینے میں کمل ہوئی۔ دس ہزار عمارت اس کی تعمیر میں مصروف رہے اور اس پر دس لاکھ پاؤ مٹ خرچ آیا۔ اس کی تعمیر میں قبصہ نے دنیا کے متنوع سنگ مرمر استعمال کیے، تعمیر میں دنیا کے خاص مصالے استعمال کیے گئے۔ دنیا بھر کے کلیساوں نے اس کی تعمیر میں بہت سے نوادرنڈ رانے کے طور پر پیش کیے۔ اور روایت ہے کہ جسٹینین اول اس کی تکمیل کے بعد پہلی بار اس میں

ترکی کی اعلیٰ عدالت نے متفقہ طور پر دنیا کی تاریخی عمارت آیا صوفیہ (Hagia Sophia Museum) کو دوبارہ بھیثیت مسجد بحال اور 1935 میں اتنا ترک کابینہ کا آیا صوفیہ کو میوزیم میں تبدیل کرنے کا فیصلہ منسوخ کر دیا۔ آیا صوفیہ اب سلطان فاتح کے فرمان کے مطابق مسجد ہو گی۔ اتنا ترک نے 1935 میں اسے میوزیم میں تبدیل کیا تھا۔ صدر اردگان نے اس سے قبل آیا صوفیہ کو مسجد قرار دیتے ہوئے قانونی کارروائی کا اعلان کیا تھا۔ ترک عدالت کے فیصلے پر شور مچانے والوں کو دوڑوک جواب دیتے ہوئے صدر اردگان نے کہا کہ آیا صوفیہ کی حیثیت پر بیرونی بیان بازی ہماری سالمیت پر حملہ تصور ہو گی۔ اس موقع پر اردگان نے استنبول میں ایک اور مسجد کا بھی سنگ بنیاد رکھ دیا اور کہا ترکی میں مسلم اکثریت آباد ہے جن کے علاوہ دیگر مذاہب کے پیروکار بھی اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ طور پر عبادت گزاری اور تہواروں کو منانے کا حق رکھتے ہیں جن کا تحفظ ہماری ذمے داری ہے۔

تاریخی پس منظر

ایا صوفیہ، سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں فتح قسطنطینیہ ہونے تک مسیحیوں کا دوسرا بڑا امداد ہبی مركز بنارہا ہے، تقریباً پانچویں صدی عیسوی سے مسیحی دنیا و بڑی سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی تھی، ایک سلطنت مشرق میں تھی جس کا پاپیہ تخت قسطنطینیہ تھا، اور اس میں بلقان، یونان، ایشیا کے چک، شام، مصر اور جبše وغیرہ کے علاقے شامل تھے، اور وہاں کا سب سے بڑا مذہبی پیشوں اپلٹریک (Patriarch) کھلا تھا۔ اور دوسری بڑی سلطنت مغرب میں تھی جس کا مرکز روم (ائلی) تھا۔ یورپ کا بیشتر علاقہ اسی کے زیر نگیں تھا، اور یہاں کا مذہبی پیشوں اپلٹریک یا پاپا کھلا تھا۔ ان دونوں سلطنتوں میں ہمیشہ سیاسی اختلافات کے علاوہ مذہبی اور فرقہ وار انہ اختلافات جاری رہے۔ مغربی سلطنت جس کا مرکز روم تھا وہ رومن کیتھولک کلیسا فرقے کی تھی۔ اور مشرقی سلطنت، آرٹھوڈوکس کلیسا فرقے کی تھی۔ ایسا

عمارت

آیا صوفیہ کے سامنے ایک خوبصورت چمن ہے، اس کے بعد اس کا مرکزی دروازہ ہے، دروازے کے دونوں طرف وہ پتھر نصب ہیں جہاں پہرہ دار کھڑے ہوتے تھے۔ اندر وسیع ہال ہے جو مریع شکل کا ہے، اس کی وسعت غلام گردش اور محراب کو چھوڑ کر جنوبًا شمالاً 235 فٹ ہے، نیچے کے گنبد کا قطر 107 فٹ اور چھت کی اونچائی 185 فٹ ہے۔ پوری عمارت میں 170 ستون ہیں۔ چاروں کونوں پر مسلمانوں نے چھڑھالوں پر اللہ، محمد، ابو بکر، عمر، عثمان اور علی نہایت خوش خط لکھ کر لگا کیا ہوا ہے۔ اوپر چھت کی طرف بڑے بڑے خوبصورت روشنی دا بنئے ہوئے ہیں۔ عمارت میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے، بیٹھا رختیاں لگی ہوئی ہیں جن پر عربی خط میں لکھا اور نقش و زنگار کیا گیا ہے۔

آیا صوفیہ میوزیم:

آیا صوفی کی عمارت فتح قسطنطینیہ کے بعد سے 481 سال تک مسجد اور مسلمانوں کی عبادت گاہ رہی۔ لیکن سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ کے بعد جب مصطفیٰ کمال اتاڑک ترکی کا سر برداہ بنا، تو اس نے اس مسجد میں نماز بند کر کے اسے میوزیم (عجائب گھر، نمائش گاہ) بنایا اور کل تک یہ نمائش گاہ تھی اور آج سے دوبارہ مسجد بن گئی۔ الحمد للہ

مسجد بحالی کا مطالبہ:

31 مئی 2014ء کو ترکی کی "نوجوانان انطاولیہ" نامی ایک تنظیم نے مسجد کے میدان میں فجر کی نماز کی مہم چلائی جو آیا صوفیہ کو مسجد بھالی کے مطالبے پر مبنی تھی۔ اس تنظیم کا کہنا تھا کہ انھوں نے دیریہ کروڑ لوگوں کی تائیدی مستحکموں کو جمع کیا ہے۔ لیکن اس وقت کے وزیر اعظم کے مشیر نے بیان دیا کہ انہی ایا صوفیہ کو مسجد میں بھال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ستمبر 2018 میں آئینی عدالت نے ایک غیر جانبدار تاریخی ورثہ ایسوی ایشن کی جانب سے اس عمارت کو نماز کے لیے کھولنے کی درخواست کو مسترد کی تھی۔ 1994 میں جب ترک صدر رجب طیب اردوغان استنبول کے نظام کا انتخاب لڑ رہے تھے تو انہوں نے اس عمارت کو نماز کے لیے کھولنے کا وعدہ کیا تھا جبکہ 2018 میں وہ یہاں قرآن کی تلاوت بھی کرچکے ہیں۔ اس کے بعد اسے دوبارہ مسجد بنانے کیلئے قانونی کارروائی شروع کی گئی۔ جس کا فیصلہ جمعرات کو سنایا جانا تھا۔ مگر عدالت نے فیصلہ محفوظ کر دیا تھا۔ جسے کل سنایا گیا۔ واضح رہے کہ آیا صوفیہ دنیا کے چند مشہور سیاحتی مرکز میں سے ہے۔ ہر سال لاکھوں سیاح آیا صوفیہ کو دیکھنے کے آتے ہیں۔ یہ 2019 میں 38 لاکھ سیاحوں کے ساتھ ترکی کا معروف ترین مقام تھا۔ اردوغان کا کہنا ہے کہ مسجد بھالی کے بعد اس سیاحوں کیلئے بلا معاوضہ کھولا جائے گا۔ (منقول)

ساحوں کیلئے بلا معاوضہ کھولا جائے گا۔ (منقول)

جب 1453ء نے عثمانی سلطان محمد فاتح نے قسطنطینیہ کو فتح کیا، اور بازنطینیوں کو شکست ہو گئی تو اس شہر کے مذہبی رہنماؤں اور راسخ العقیدہ عیماً یوں نے اسی کلیسا میں اس خیال سے پناہ لے لی تھی کہ کم از کم اس عمارت پر دشمن کا قبضہ نہیں ہو سکے گا۔ مشہور انگریز مؤرخ ایڈورڈ لین منظر کشی کرتے ہوئے لکھتا ہے: ”گرجا کی تمام زینی اور بالائی گیلریاں بالپوں، شوہروں، عورتوں، بچوں، پادریوں، راہبوں اور کنواری نوں کی بھیڑ سے بھر گئی تھی، کلیسا کے دروازوں کے اندر اتنا بجوم تھا کہ ان میں داخلہ ممکن نہ رہا تھا۔ یہ سب لوگ اس مقدس گنبد کے سامنے میں تحفظ تلاش کر رہے تھے جسے وہ زمانہ دراز سے ایک ملأاً اعلیٰ کی لا ہوتی عمارت سمجھتے آئے تھے۔ یہ سب ایک افترا پر داز الہام کی وجہ سے تھا جس میں یہ جھوٹی بشارت تھی کہ جب ترک دشمن اس ستون (قسطنطین ستوں) کے قریب پہنچ جائیں گے تو آسمان سے ایک فرشتہ ہاتھ میں تلوار لیے نازل ہو گا اور اس آسمانی ہتھیار کے ذریعے سلطنت ایک ایسے غریب آدمی کے حوالے کر دے گا جو اس وقت اس ستون کے پاس بیٹھا ہو گا۔

The Decline and Fall of the)

آماده مسجد

قططنهينه چونکہ سلطان کی طرف سے صلح کی پیشکش کے بعد بزرگ شیر فتح ہوا تھا، اس لیے مسلمان ان ٹکیساوں کو باقی رکھنے کے پابند نہ تھے اور اس بڑے چرچ کے ساتھ جو توہمات اور باطل عقیدے وابستہ تھے انھیں بھی ختم کرنا تھا۔ اس لیے سلطان محمد فاتح نے اس چرچ کو مسجد میں تبدیل کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ اسے مال کے ذریعہ خریدا گیا، اس میں موجود رسوم اور تصاویر کو مٹا دیا گیا یا چھپا دیا گیا اور محراب قبلہ رخ کر دی گئی، سلطان نے اس کے میناروں میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اس کے بعد یہ مسجد "جامع آیا صوفیہ" کے نام سے مشہور ہو گئی اور سلطنت عثمانیہ کے خاتمه تک تقریباً پانچ سو سال تک





کردار کو ختم کر کے میوزیم میں تبدیل کیا گیا وہ قانون سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔

فیصلے پر رد عمل اور ترک حکومت کا موقف

روس کی خبر ساراں ایجنسی تاس کے مطابق روس کے آرٹھوڈاکس چرچ نے ترکی کی عدالت کے فیصلے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ عدالت نے آیا صوفیہ کے بارے میں فیصلہ سناتے ہوئے ان کے تحفظات کو اہمیت نہیں دی ہے۔ روس کے آرٹھوڈاکس چرچ نے کہا کہ اس فیصلے سے اختلافات میں مزید اضافہ ہو گا۔ ترکی کے نوبیل انعام یافتہ مصنفوں اور ہانپا مک نے بی بی سی بات کرتے ہوئے کہا کہ ”آن لامکھوں سیکیوریتک اس فیصلے پر رد عمل گے لیکن ان کی آواز کوئی نہیں سنے گا۔ البتہ ترکی نے ان دعووؤں کی نفی کی ہے کہ عدالتی فیصلے کی وجہ سے آیا صوفیہ دوسرے مذاہب کے لیے بند ہو جائے گی۔ ترکی کے صدارتی ترجمان ابراہیم کالن نے کہا آیا



صوفیہ کو عبادت کے لیے کھولنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ مقامی یا غیر ملکی سیاحوں کے لیے بند ہو جائے گی۔ گذشتہ سال اپنی انتخابی مہم کے دوران صدر اردوغان نے اس تبدیلی کا وعدہ کیا تھا۔ ترکی میں قدامت پسند مسلمان کئی برسوں سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس عمارت کو ایک مسجد بنایا جائے۔ تاہم حزبِ مخالف میں موجود سیکیوریتی ایسی قوتیں نے اس اقدام کی مخالفت کرتے آئے ہیں۔ اس تجویز پر بین الاقوامی سطح پر بھی تقيید کی گئی اور دنیا بھر کے مذہبی اور سیاسی رہنماؤں نے اس پر تشویش کا اظہار کیا۔ مشرقی آرٹھوڈاکس چرچ کے سربراہ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ یونان نے بھی اس اقدام کے خلاف بات کی تھی اجہاں لاکھوں آرٹھوڈوکس مسیحی رہتے ہیں۔ یونان میں وزیر برائے ثقافت نے ترکی پر الزام لگایا تھا کہ وہ قوم پرستی اور مذہبی جذبات کو جنونی حد تک بڑھا دے رہا ہے اور ان کا اصرار تھا کہ یونیسکو کی ورلڈ ہیریتیج سائٹ کو تنظیم کی اپنی کمیٹی کی منظوری کے بغیر تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ادھر یونیسکو کے ڈپنی ڈائریکٹر ارنسٹو رامیریز نے بھی اس بات سے اتفاق کیا تھا اور ان کا کہنا تھا کہ یونیسکو نے ترکی کو اس سلسلے میں خط لکھا ہے تاہم ابھی تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا ہے۔

ترکی کے صدر رجب طیب اردوغان نے استنبول کی تاریخی اہمیت کی حامل عمارت آیا صوفیہ کو مسجد میں تبدیل کرنے کے صدارتی حکم نامے پر دستخط کر دیے ہیں۔ ترکی کے صدر کی طرف سے یہ صدارتی حکم نامہ جمعہ کوہی ترکی کے ایک عدالت کے اس فیصلے کے بعد جاری کیا گیا ہے جس میں آیا صوفیہ کی عمارت کی میوزیم کی حیثیت کو ختم کر دیا گیا تھا۔ یہ عمارت جو ۷۰۰ ہزار سال پہلے ایک کلیسا کے طور پر تعمیر کی گئی تھی، اس کی حیثیت کو بدلتے ہوئے اس کا باعث رہا ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے دور میں اس عمارت کو کلیسا سے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ جو لائی کے شروع میں ترکی میں کاؤنسل آف سٹیٹ نے استنبول میں موجود آیا صوفیہ کو ایک مسجد میں تبدیل کرنے سے متعلق فیصلہ موجہ کیا تھا جو جمعہ کو سنا یا گیا جس کی وجہ سے اس صدارتی فیصلے کی راہ ہموار ہوئی ہے۔ اس عمارت کو اقوام متحدہ کا ادارہ یونیسکو عالمی ورثہ قرار دے چکا ہے۔ یونیسکو نے ترکی سے کہا تھا کہ وہ اس

کی حیثیت تبدیل نہ کرے۔ ترکی کے صدر رجب طیب اردوغان اس عمارت کو مسجد بنانے کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ یہ عمارت چھٹی صدی میں بازنطینی بادشاہ جیشیین اول کے دور میں بنائی گئی تھی اور تقریباً ایک ہزار سال تک یہ دنیا کا سب سے بڑا گرجہ تھا۔ سلطنت عثمانیہ نے جب 1453ء میں اس شہر کو فتح کیا تو اسے ایک مسجد بنادیا گیا تاہم بعد میں 1930 کی دہائی میں اسے ایک میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

عدالت نے فیصلے میں کیا کہا؟

جدید ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک نے 1934ء میں آیا صوفیہ کو میوزیم بنانے کی منظوری دی تھی اور اس وقت سے اسے سیکولر ایم کی ایک نشانی کے طور پر دیکھا جاتا ہے جو تمام مذاہب کے پیروکاروں کے لیے محلی ہے۔ لیکن ترکی کی سب سے اعلیٰ انتظامی عدالت، کاؤنسل آف سٹیٹ نے جمعہ کو اپنے فیصلے میں لکھا ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تصفیے کی دستاویز میں اسے مسجد کے لیے مختص کیا گیا ہے اس قانونی طور پر اسے کسی اور مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

عدالتی فیصلے میں کہا گیا ہے 1934 کا کا بینہ کا فیصلہ جس میں اس عمارت کے مسجد کے

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا

ایک سجدے کے عوض خاص ٹھکانے دینا
اے فرشتو ! میری مخلوق کو جانے دینا

میری درگاہ سے بھٹکا ہوا ٹھوکر کھا کر
لوٹ آئے کوئی کم بخت تو آنے دینا

کوئی گپڑا جو گناہوں سے لدا ہو اس دن
خوف سے اشک بھائے تو بھانے دینا

آگ کے خوف سے سہا ہوا مجرم اپنی
آنکھ جنت پہ جمائے تو جمانے دینا

وہ جسے لوگ سمجھتے تھے مجسم نفرت
حال اپنا جو بتائے تو بتانے دینا

میرے بھوکوں کی ضیافت پہ لٹانے والا
میری بانہوں میں سمائے تو سمانے دینا

میرے ننگوں کے بدن ڈھانپے والا بندہ
مجھے پوشاک بنائے تو بنانے دینا

وہ خطاکار جسے آپ ہو نفرت خود سے
مجھے سینے سے لگائے تو لگانے دینا

نام اپنا جو بتائے میں غضنفر عاجز
آئے گردن کو جھکائے تو جھکانے دینا

(حافظ اسد اللہ وحید۔ سیر الیون)



یہ معروف عمارت استنبول کے فیتح ڈسٹرکٹ میں سمندر کے کنارے واقع ہے۔ بازنطینی بادشاہ جستینیان اول نے اس کی تعمیر کا حکم سنہ 532 میں دیا تھا جب اس شہر کا نام قسطنطینیہ تھا۔ یہ یورپی سلطنت (جسے مشرقی رومی سلطنت بھی کہا جاتا ہے) کا دارالحکومت بھی تھا۔ ماہرین بحیرہ روم کے پار سے اس عمارت کی تعمیر کے لیے اشیائی تھے۔ سنہ 537 میں جب یہ عمارت مکمل ہوئی تو یہ آور تھوڑوں کس چرچ کے سربراہ کا مقام بن گئی۔ اہم ترین بازنطینی تقریبات جیسے کہ تاج پوشی اس عمارت میں ہونے لگیں۔ تقریباً نو سو سال تک یہ عمارت آور تھوڑوں کس چرچ کا گھر رہی۔ نیچے میں 13 ویں صدی میں یہ کچھ عرصے کے لیے کیتھوںک چرچ کے زیر انتظام بھی رہی جب یورپی حملہ آوروں نے قسطنطینیہ کا کنشروں سنبھال کر چوتھی صلیبی جنگ میں شہر میں لوٹ مار کی۔ تاہم 1453 میں سلطنت عثمانی نے سلطان محمد دوم کے دور میں قسطنطینیہ پر قبضہ کیا، شہر کا نام تبدیل کر کے استنبول رکھا اور بازنطینی سلطنت کا خاتمه کر دیا۔ اس عمارت میں داخل ہوتے وقت سلطان محمد دوم کا اصرار تھا کہ اس کی تعمیر نوکی جائے اور اسے ایک مسجد بنایا جائے۔ انہوں نے اس میں جمعہ کی نماز بھی پڑھی۔ سلطنت عثمانیہ کے معماروں نے آور تھوڑوں کس نشانیاں مٹا دیں اور عمارت کے ساتھ منار کھڑے کر دیے۔ 1616 میں استنبول کی معروف بلومونت کی تعمیر تک آیا صوفیہ ہی شہر کی مرکزی مسجد تھی۔ 1891 میں سلطنت عثمانیہ کو پہلی جنگ عظیم میں شکست ہو گئی۔ ترکی میں قوم پرست سیاسی قوتوں نے پروان چڑھی اور اس سلطنت را کھی میں سے جدید ترکی نے جنم لیا۔ مصطفیٰ کمال اتا ترک نے عمارت کو ایک میوزیم بنانے کا حکم دیا اور 1935 میں اسے عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا۔ یہ ترکی کی اہم ترین سیاحتی عمارتوں میں سے ایک ہے۔

اس سے فرق کیا پڑتا ہے؟

اس عمارت کی 1500 سالہ تاریخ کی وجہ سے ترکی کے اندر اور باہر کئی لوگوں کے لیے مذہبی، روحانی اور سیاسی عقیدت رکھتی ہے۔ قدامت پسند مسلمانوں کا مطالبه رہا ہے کہ اسے واپس ایک مسجد بنایا جائے اور اس سلسلے میں انہوں نے مظاہرے بھی کیے تاہم ترکی کا 1934 کا ایک قانون اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ صدر اردوغان نے اس مطالبے کی تائید کی تھی۔ انہوں نے اسے ایک میوزیم بنائے جانے کا یک غلطی قرار دیا تھا اور مشیران کو کہا تھا کہ وہ اسے واپس مسجد بنانے کے طریقے نکالیں۔ ادھر مشرقی آور تھوڑوں کس چرچ کی بنیاد بھی بھی استنبول میں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس تبدیلی سے لاکھوں مسیحی مالیوں ہوں گے۔ امریکی وزیر خارجہ نے کہا تھا کہ عمارت کے درجے میں تبدیلی سے اس کی مختلف مذاہب کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرنے کی صلاحیت میں کمی آئے گی۔



انسانی ڈھانچوں کے بنے پرتگالی چرچ کی اصل کہانی

تحریر: ہارون ملک

ہرگز نہیں ہے۔ پرتگالیوں کے ہاں مختلف لیجندز یعنی فوک کہانیوں میں لکھتے ہوئے انسانی ڈھانچوں کے متعلق ایک کہانی یہ بھی ہے کہ یہ اپنے زمانے کا کوئی بڑا نامور اور امیر آدمی تھا جس کی نعش کو قبرستان میں جگہ نہ ملی تو اُس کو اس چیل میں رکھا گیا۔ ایک لیجند کے مطابق ایک بڑی لاش ایک گناہگار کی ہے جو زانی تھا اور بچے کی لاش اُس زنا کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بچے کی ہے اور ان کو اُس آدمی کی بیوی کی بد دعا لگی تھی۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا یہ ایک کہانی ہے جو مقامی افراد میں بذریعہ سینہ گزٹ چلتی آ رہی ہے۔ کچھ افراد کا کہنا ہے کہ پوپ انسانی ہڈیوں اور باقیات کو بعد از مرگ انسان کی کیا حالت ہوتی ہے کہ تنبیہ کے طور پر دکھانا چاہتے تھے تاکہ لوگ گناہوں سے ڈور ہو کر خدا کے قریب ہوں یعنی اس کا مقصد لوگوں کو آئندہ زندگی یعنی حیات بعد الموت کی یاد کیا وہی کروانا تھا۔ ان ہڈیوں کا مسلمانوں سے، صلیبی جنگوں سے یا ایسی کسی بھی کہانی سے کوئی لینا دینا نہیں کیونکہ چرچ کی تعمیر سولہویں صدی عیسوی میں ہوئی اور اس صدی میں مسلمانوں یا یہودیوں کی جلاوطنی، قتل کے واقعات نہیں ہوئے۔ پرتگال کی تاریخ میں ایسے دوالگ الگ واقعات ضرور ہوئے ہیں جب مسلمانوں اور یہودیوں پر مظالم کرنے کے لیکن وہ قصہ سولہویں صدی سے متعلق نہیں اور نہ یہ ہڈیاں اُن واقعات سے متعلق ہیں۔

چرچ کے دروازے پر پرتگالی زبان میں یہ عبارت لکھتا ہے:

"Nós ossos que aqui estamos, pelos vossos esperamos."

"ہماری ہڈیاں تو یہاں پہنچ چکی ہیں اور تمہاری ہڈیاں کا انتظار ہے"

یعنی ہم تو اپنی زندگی گزار کرموت کی وادیوں میں آچکھے بس تھم آنے کو ہو۔

دوستو یہ مظلومیت کے قصے اور خودترسی کے سے جذبات سوائے ہمارا اپنا مذاق بنوانے کے اور کچھ فائدہ نہیں دیتے۔ انڈونیشیا اور بعض عرب ممالک میں یہ قصے بھی ایسے ہی مشہور ہیں جہاں سے ہمارے بھائی بہن ایسی کہانیاں لے آتے ہیں اور عوام "ہائے اللہ، اتنا ظلم، ہائے ہمارے مسلمانوں پر کیا کیا ستم توڑے گئے" وغیرہ جیسے کلمات لکھ لکھ کر "جھلے اور کملے" ہوئے پھرتے ہیں۔ حقائق کو جاننے کی کوشش کیا کریں اور جہاں یہ مظلومیت کی جعلی کہانی نظر آئے وہاں اس پوسٹ کا انک چپا دیں۔ (بشكريہ پختند کام)

بے وقوف انہ اور بے سرو پا کہانیوں پر اعتبار کرنے میں ہمارا شاید پہلا نمبر ہو۔ ایسی کہانیاں جہاں دنیا کو شدید ظالم اور ہمیں مظلوم دکھایا گیا ہو، ایسی کہانیاں جو خودترسی کے قابلِ رحم جذبات پیدا کرتی ہوں وہاں ہماری "باقھیں" کھل کھل جاتی ہیں۔ آج کل سوچل میڈیا پر پھر سے ایک کہانی بھیت گردش کر رہی ہے جس میں آسٹریا، چیک رپیبلک اور پرتگال میں موجود چرچ دکھائے جا رہے ہیں جو انسانی ہڈیوں اور باقیات سے "مزین" ہیں، مزین ایک اچھا لفظ نہیں اس جگہ پر لیکن فی الحال جانے دیتے ہیں۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ انسانی ہڈیاں ہزاروں مسلمانوں کی ہیں۔ ریکلی؟ اور ہمارے جذباتی بھائی بہن اس کو شیخیر کر کر کے "جھلے" ہوئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک پرانا موضوع ہے لیکن چونکہ آج کل پھر سے بہت گرم ہے تو سوچا اس کی وضاحت کر دوں کیونکہ کچھ عرصے بعد پھر سے ہماری یادداشت چلی جاتی ہے۔

ماہنامہ لاہور انٹرنیشنل ہڈیوں ہے، ملکیہ کو سیاحوں کے لیے کھولا جا چکا ہے۔" دیکھیں فی الحال زیادہ رولا اور شور شراب تو پرتگال کے شہر The Evora Capela dos Ossos یا انگریزی میں چیل اوو بوونز کا مجاہوں اے۔ یہ چیل Igreja Real de Sao Francisco فرانسز کا ایک حصہ ہے۔ بے شک ایسا چیل موجود ہے جس کی دیواروں میں انسانی ہڈیوں کا استعمال کیا گیا ہے لیکن یہ ہڈیاں کسی مسلمان تو دُور کسی بھی دُسرے مذہب کے انسانوں کو مار کر نہیں نکالی گئیں بلکہ یہ ہڈیاں سولہویں صدی کے آس پاس چرچ سے ملحقہ قبرستانوں جو کہ تعداد میں بیالیس یا تینا لیس تھے، میں قبروں کی جگہ کم ہونے اور بعض حالات میں اُن قبرستانوں کو کاشتکاری یا پیداواری مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے پوپ کے فیصلے کے بعد وہاں کی قبروں سے انسانی باقیات یعنی ہڈیاں وغیرہ جو ظاہر ہے عیسائیوں کی قبریں تھیں؛ اُن کو یہاں کر ضائع نہ کیا گیا بلکہ یہاں دیواروں پر چن دیا گیا تاکہ ایک عقیدے کے مطابق اُن کی رو جیں بھٹکتی نہ رہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ کوئی پانچ ہزار کے قریب انسانی نعشیں تھیں جن کی ہڈیاں یہاں موجود ہیں۔ کچھ صدیاں پہلے سینکڑ بیسیل یا دوبارہ دفن کرنے کی رسم عام تھی۔ بر سیل تذکرہ اس چیل کا ذیراً مین اٹلی کے شہر میلان کے چرچ San Bernardino alle Ossa سے متاثر ہے اور یہ ہڈیوں کا ایسا استعمال اپنی نوعیت کا کوئی انوکھا واقعہ

کے کارناموں کی وجہ سے، عطا کیں۔ اس مغلیہ زوال کے زمانے میں۔ جب مغل شہزادگان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت نبوی کے تبرکات (جو ان کے پاس ترک سلاطین کے قبیلہ جات سمیت) اپنے نان و فقہ کے لئے بیچتے پھرتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حکم سے، منہ مانگی قیمت تو پرفیور برادران نے خریدے اور جو میلی فقیر خانہ سے متصل مخصوص تعمیر کردہ عمارت میں جمع کئے۔ اکالیوں کا شددہ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ، دو مختلف حقیقتیں ہیں۔ انتساب یہ ہے کہ ان کو گذرنہ کریں۔ اور اس پہلو کو مدنظر رکھیں کہ مغل بد نظمی اور اکالی سکھا شاہی سے مسلمانوں کو نجات مہاراجہ رنجیت سنگھ ہی کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد مہاراجہ کھڑک سنگھ حکمران ہوئے اور سکھا شاہی کے دوسرا دور کا آغاز ہوا۔ جو بالآخر شہزادہ دلیپ سنگھ اور ان کی والدہ کی جلاوطنی اور سکھ حریت پسندوں کی گجرات کے نزدیک ”چلیاں والہ“ میں انگریزوں سے شکست پر منجھ ہوا۔ حوالوں کے لئے مندرجہ ذیل حسب تو فیض ضرور دیکھیں:-

- ۱۔ اپنا اورگ۔ کام APNAORG.COM/Books
- ۲۔ دیوان منور، فقیر سید نور الدین بخاری پنجم لارہور
- ۳۔ چلیاں والہ، میمحن معین باری
- ۴۔ مختصر تاریخ پاکستان و ہند، مولانا غلام رسول مہر
- ۵۔ مقالات آزاد، مولانا محمد حسین آزاد

مہاراجہ رنجیت سنگھ مہاراجہ کے بت کی بیرون (مرہٹی رنجیت سنگھ) بادشاہی مسجد سے لاہور عجائب گھر میں منتقلی نے ایک عجیب اخباری بحث شروع کر دی ہے۔ جس میں بیشتر ادھوری اور تمہم تاریخ لکھی جا رہی ہے۔ اسی پس منظر کا یہی ایک تقاضا ہے کہ کچھ احوال از سرنو اس خوفناک ابہام کو دور کرنے کے لئے پیش منظر پا آسکے۔ ورنہ جو حال صحافتی ذمہ داری کا سچ لکھنے میں ہو چکا۔ وہ دلدوڑ اور دلخراش اور دل شکن ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ مہاراجہ نے پنجاب پر اپریل ۱۸۴۶ء سے جون ۱۸۴۹ء تک حکمرانی کی۔ آپ کی پیدائش گوجرانوالہ میں ”شکر چکیا“ مسل میں ۱۳۔ نومبر ۱۸۰۷ء کو ہوئی۔ یوں آپ کی حکمرانی کا دور بارہ برس کی عمر میں ہی شروع ہو گیا۔ اس زمانے کے مغلیہ انتظامی یونٹ ”مسل“ کھلاڑتے تھے اور مسل بردار مغلیہ مرکزی بندوقی کے باعث۔ من مانیاں بھی کرتے تھے۔ گور و گونڈ مہاراجہ کی شہادت نے، سکھوں کی مسلمان دشمنی کو مزید ہوادے رکھی تھی۔ اور مسلمان تقریباً ہر مسل میں زیر عتاب تھے۔ نتیجے کے طور پر مسلمانوں پر ظلم اور بربریت کا عام روایج تھا۔ مسلمان مغلیہ جا گیریں تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ اس آشوب میں ریاست پٹیالہ، ریاست کپور تھله، ریاست فرید کوٹ اور آہلو والیہ مسل کا کردار نسبتاً مسلمانوں کے حق میں رہا اور بیشتر مسلمان معززین انہی مقامات میں اس وقت تک پناہ گزین رہے۔ جب تک مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت کے تحت وہ مسلمان جا گیریں دوبارہ بحال کیں اور پناہ گزین مسلمانوں کو واپس ان کے علاقہ جات میں آباد کیا۔ یہ ”سکھا شاہی“ کا پہلا دور تھا۔ جس کا اختتام مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت نے کیا اور مسلمان خاندانوں کو ”مذہبی متشدد“ سکھا شاہی سے بڑی حد تک نجات نصیب ہوئی۔ تاہم سکھا شاہی کا بقیہ حصہ ”اکالی جھوٹوں“ کی شکل میں پدستور موجود رہا۔ جس میں ”رام گڑھ مسل“ کے اکالی پیش پیش رہے۔ ان اکالیوں کی سرکوبی۔ رنجیت سنگھ حکومت کے لئے تا دیر ایک امتحان رہا۔ دوسری بات جس میں ابہام کثیر ہے۔ وہ جا گیر اور جا گیر دار کا تصور ہے۔ اس زمانے میں جا گیر ایک حکومتی انتظامی یونٹ تھا۔ اور ہر گز اس نجح پر نہیں تھا۔ جس کا تصور انقلاب روس اور بر صغیر کی فلموں سے ابھرتا ہے۔ تیرے یہ کہ۔ بزرگان فقیر خانہ (لاہور) کو عوام دشمن اور عوامی رفاه کے خلاف سمجھنا بس ایک صحافتی فیش سا بن کے رہ گیا ہے۔ اور کسی کو یہ خیال نہیں آتا اور درد محسوس نہیں ہوتا کہ۔ اس پر آشوب دور میں، جب مغل انتظامیہ ناکام ہو چکی تھی اور اکالی جھٹے و حشت کا کھیل مسلمانوں کے خلاف کھیل رہے تھے۔ اس وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ نے نہ صرف ان کی بغاتوں کو کچلا۔ بلکہ فقیر سید عزیز الدین کو اپنا وزیر اعظم، وزیر خارجہ اور خزانوں کا سربراہ مقرر کیا اور فقیر سید نور الدین کو داخلی امور تفویض کئے۔ یہ بڑی آسان اور عالمیانہ بات ہے کہ فقیر صاحب جان نے بڑی مراعات حاصل کیں۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ وہ ”مراعات“ مہاراجہ نے بغیر کسی ذاتی التجاکے از خود، فقیر برادران کو ان



پاکستان قونصلیٹ جزء جدہ



تحریر: عابد شمعون چاند (نماں ندہ لاہور انٹرنیشنل سعودی عرب)

9 جولائی 2020 سعودی عرب (عابد شمعون چاند) قونصل جزء جدہ خالد مجید نے آج قونصلیٹ میں پریس کے نمائندگان سے ملاقات کی اور قونصلیٹ کی پچھلے چند ماہ کی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ کورونا وباً مرض جدہ میں پاکستان قونصلیٹ کے لئے بہت چیلنج رہا۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے صورتحال سے اپنی بھرپور صلاحیتوں سے نپنچہ کی کوشش کی اور اللہ کے فضل سے ان مشکل حالات میں کامیاب حاصل ہوئی۔

پہلا چیلنج میں الاقوامی پروازوں کی بندش کے بعد عمرہ زائرین کی واپسی کا تھا۔ کی۔ ہم اپنے متمول کمیونٹی ممبران اور تنظیموں کے بھی شکرگزار ہیں جو ہماری دعوت پر منداور بے سہارا پاکستانیوں میں کھانے کی چیزیں اور راشن بیگ تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ ہم اپنے متمول کمیونٹی ممبران اور تنظیموں کے بھی شکرگزار ہیں جو ہماری دعوت پر

آگئے اور برادری کے افراد کی مدد کی۔ قونصل جزء خالد مجید نے بتایا کہ پاکستانیوں میں نرمی اور کرفیو اٹھانے کے بعد، قونصلیٹ نے سعودی حکومت کے اعلان کردہ تمام احتیاطی تدابیر کو منظر رکھتے ہوئے



پروازوں کی بندش کے بعد 500 کے قریب عمرہ زائرین پیچھے رہ گئے تھے۔ سعودی حکومت کی مدد اور معاونت اور سعودی وزارت حج و عمرہ کے قریب ہم آہنگی سے، ہم ان حاجیوں کو سعودی ایئر لائن کی دو پروازوں کے ذریعے وطن

واپس بھیج سکے۔ اس کے بعد، سعودی عرب میں خصوصی پروازوں کے ذریعے پہنچنے ہوئے پاکستانی کمیونٹی کی وطن واپسی کا چیلنج درپیش تھا۔ وطن واپسی کے لئے ہماری ترجیحات میں وزٹ ویزا، خروج نہائی اور طبی ہنگامی صورتحال تھیں۔ ایسے لوگوں کی شناخت کے لئے ایک فارم سوچل میڈیا کے ذریعے سرکولیٹ کیا گیا۔ پورے سعودی عرب میں 34000 کے قریب پاکستانیوں نے اس فارم کے ذریعے اپنے آپ کو جسٹس کیا۔ ابتدائی طور پر پی آئی اے کے نکٹیں قونصل خانے کے احاطے سے فروخت کی جا رہی تھیں جس کی وجہ مقامی حکام کی جانب سے تجارتی علاقوں کو کھولنے پر پابندی تھی۔ اس مقصد کے لئے قونصل خانے میں پی آئی اے کا ایک خصوصی کاؤنٹر کام کر رہا تھا۔ بعد میں جب یہ پابندیاں ختم کر دی گئیں، تو 15 جون، 2020 سے مجاز ایجنٹوں اور پی آئی اے کے دفتر سے نکٹ دستیاب تھے۔ کیم می سے جب سے خصوصی پروازیں شروع ہوئی ہیں، مملکت کے مغربی علاقے سے 64 پروازیں تقریباً 14000 مسافروں کو واپس پاکستان لے گئیں۔ یہ پروازیں جدہ سے اور بعد میں مدینہ سے

جنہوں نے مملکت میں کورونا کے خلاف فرنٹ لائن فورس کے طور پر اپنا کردار ادا کیا۔ انہوں نے پاکستانی ڈاکٹروں کے لئے بھی دعا کی جنہوں نے لائن آف ڈیوٹی میں اپنی جان کی پرواہ بخیر اپنا فرض نہ بھایا اور اپنی زندگی گنوادی۔

پاکستانی ایگزیکیٹیو فورم کی نیوز

حقوق اور پائیدار ترقی کا فروغ ہے میر احمد شاد نے کہا کہ پاکستانی ایگزیکیٹیو فورم پاکستانی اشیاء کو فروغ دینے اور انویسٹر کو پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے کی جدوجہد جاری رکھے گا سعودی عرب سے شروع ہونے والا یہ سفر کامیابیوں کے ساتھ جاری و ساری رہے گا تقریب سے؛ ملک کلیم، حافظ سجاد، حاجی مجاہد مقبول، خرم عظیم، حافظ عمران؛ نافع حسین، اشتیاق ہاشمی، ابو بکر منور، آصف ریاض، عمر مجدد، حافظ شبیر، اکرم قریشی، کامران رشید، اکبر خواجہ، عزیز ملک، وسیم ملک، عاصم بیگ، مرزاعمر بیگ، طارق شہزاد، خرم عظیم خان، فرحان طفیل، طاہر انعام، محمد علی خان، اخلاص الدین، علی ظہیر، اور دیگر نے بھی خطاب کرتے ہوئے



10 جولائی 2020ء سعودی عرب (عبد شمعون چاند) سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں پاکستانی ایگزیکیٹیو فورم کا ایک سال مکمل ہونے پر مقامی ہوٹل میں تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں کیونٹی اکابرین صحافیوں اور مقامی ممبر ان شامل ہوئے جبکہ دیگر ممالک کے ممبران نے آن لائن شرکت کی تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوت قرآن مجید فرقان حمید سے کیا گیا جبکہ نظمت کے فرائض نافع حسین نے سر

انجام دیتے ہوئے معزز مہمانوں کو خوش آمدید کہا اور پاکستانی ایگزیکیٹیو فورم کی ایک سالہ کارگردگی پر روشنی ڈالی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہماں خصوصی سفارتخانہ پاکستان ریاض کے منظر آف ٹریڈ ایئڈ

انوسمینٹ اظہر علی داہر نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی ایگزیکیٹیو فورم نے بلاشبہ ایک سال میں برسوں کا سفر طے کر کے فورم کو کامیابیوں کی طرف گامزن کیا اس مبارک باد کے مستحق ہیں پاکستانی ایگزیکیٹیو فورم کے صدر میر احمد شاد اور دیگر عہدیدار ممبران کامیابی میں پاکستانی ایگزیکیٹیو فورم کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا بھی کی گئی۔

پاکستانی ایگزیکیٹیو فورم کو کامیابی کا سفر طے کرتے ہوئے پہلا سال مکمل کرنے پر مبارک باد کے مستحق ہیں پاکستانی ایگزیکیٹیو فورم نے ہمیشہ پاکستان کی ترقی اور خوشحالی میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا ہے جس پر میں ان کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں مہماں خصوصی نے مزید کہا کہ ہم پاکستانی انویسٹر کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ سعودی عرب میں سرمایہ کاری کو فروغ دیں جس کے لیے ہم ان کو اپنی خدمات پیش کرتے رہے گے ہم سب نے پاکستان کی ترقی کے لیے اپنا اپنا حصہ ڈالنا ہوگا۔

پاکستانی ایگزیکیٹیو فورم کے مرکزی صدر میر احمد شاد نے خطاب میں کہا کہ 04 افراد سے شروع ہونے والے اس فورم میں مختلف ممالک سے 500 سے زائد ممبران شامل ہو کر اپنی اپنی خدمات سر انجام دے رہے ہیں جو قابل تاثر ہے انہوں نے کہا کہ ہماری کامیابی کی بنیاد ہمارے اس فورم سے ہے لوگ ہیں ہم اپنی کارگردگی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے ہر وقت کوشش ہے ہمارا مشن میں الاقوامی اور علاقائی امن و امان کے ہدف کے ساتھ پاکستان کی تعمیری اشتراک کا تحفظ پاکستان میں انسانی

ضروری ادارتی نوٹ

نوٹ فرما لیں ادارتی نوٹ مضمون کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ مصنف کی رائے، خیال، اپنا ہوتا ہے ضروری نہیں مصنف سے ادارہ متفق ہوا سی لیے بعض مضامین پر ادارتی نوٹ دیا جاتا ہے اور ایڈٹ بھی کیا جاتا ہے علاوہ ازیں یہ بھی نوٹ فرما لیں آن لائن ویب سائٹ اور رسائل میں شائع شدہ مواد کا پی راست ہیں۔ بلا اجازت آرٹیکل شائع کرنا کا پی راست قوانین کی خلاف ورزی اور جرم ہے کچھ احباب ایسا کر رہے ہیں انکو متنبہ کیا جا رہا ہے۔

وہ درخت جس نے کروڑوں انسانی زندگیاں مچانے

میں مدد کی مگر خود معدومیت کا شکار ہوا

صحت کے مطابق دنیا کی آدمی آبادی اب بھی ان علاقوں میں رہتی ہے جہاں اس بیماری کا انفیکشن موجود ہوتا ہے۔ اطالوی زبان میں 'ملیریا' کا مطلب خراب ہے۔ اس فاسد خیال کی وجہ سے عہد و سلطی میں اس کا علاج بھی غلط طریقے سے کرنے کی کوشش کی گئی۔ ملیریا کا علاج جسم سے خون نکال کر، اعضا کو کاٹ کر یہاں تک کہ کھوپڑی میں سوراخ کر کے بھی کیا جاتا تھا۔ ملیریا کی پہلی دوا 17 ویں صدی میں اینڈیز کے گھنے جنگلات میں دریافت ہوئی۔

زبانی قصوں کے مطابق کوئین
کی دریافت 1631 میں ہوئی
تھی۔ پسین سے تعلق رکھنے والی
ایک امیر خاتون کا نامیں آف
سنکونا کی شادی پیرو کے
وائسرائے سے ہوئی۔ وہ بیمار
پڑ گئیں، تیز بخار کے ساتھ بدن

پر کپکی طاری ہوتی تھی، جو کہ ملیر یا کی علامات ہیں۔ اپنی الہمیہ کا علاج کرنے کے لیے دائرے نے انھیں ایک دوالپلائی جو جیسوٹ پچاریوں نے تیار کی تھی۔

درخت کی چھال کی دوائی

اس دوں میں ایک درخت کی چھال تھی جسے لوگ، گلاب کے پتے اور کچھ دوسرے سوکھے پودوں کے ساتھ پیس کر تیار کیا گیا تھا۔ کاؤنٹیس جلد صحیتیاب ہو گئیں۔ جس کرشماتی درخت سے انھیں شفا ہوئی تھی اسے 'سنکونا' کا نام دیا گیا۔ آج یہ پیر و اور ایکواڈور میں قومی درخت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیادہ تر موخرین اس کہانی کو نہیں مانتے لیکن اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔ کونین ایک الکلائنس مرکب ہے جو سنکونا کی چھال میں پایا جاتا ہے۔ یہ ملیریا پھیلانے والے اقسام کو مار سکتا ہے۔ لیکن اس کا پتا پسین کے جیسوٹ پچاریوں نے نہیں چلا�ا تھا۔ کینسلس کہتی ہیں کہ پسین کے لوگوں کے آنے سے قبل ہی کچھوا، کنیری اور چیمو قبائل کو کونین کا علم تھا۔ انھوں نے ہسپانوی جیسوٹ کو چھال کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ تینوں قبائلی گروہ موجودہ پیرو، بولیو یا اور ایکواڈور میں رہتے ہیں۔ جیسوٹ کے پچاریوں نے سنکونا کی دارچینی جیسی چھال پیس

جنوب مغربی پیروں میں جہاں اینڈیز اور ایکیزون بیسک ملتے ہیں وہاں ہر ابھر اوسیں
منویشنل پارک ہے۔ 15 لاکھ ہیکٹر پر پھیلا یہ پارک کرہ ارض پر سب سے زیادہ
حیاتیاتی تنوع سے مالا مال مقامات میں سے ایک ہے۔ اس علاقے پر دھنڈ کی ایک
چادر پھیلی ہوتی ہے اور یہاں کم ہی لوگوں کا آنا جانا ہوتا ہے۔ دریاؤں کو عبور کر کے جب
آپ تیندوؤں، چینیوں اور جیکوار سے بچتے بچاتے اس گھنے جنگل میں پہنچیں گے تو آپ

وہاں 'سنکونا آفیئنیلیس'، درخت کی چند بچی کچھی اقسام کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو لوگ ان درختوں کو نہیں پہچانتے ان کے لیے اس بارش والے جنگل کی بھول بھولیوں میں 15 میٹر لمبے سنکونا کے درختوں کی شناخت بہت مشکل ہو سکتی ہے۔ اینڈیز کے

دامن میں اُگنے والے اس درخت سے بہت سارے افسانے جڑے ہیں جس نے
صدیوں تک انسانی تاریخ کو متاثر کیا ہے۔ پیرو کے ایکیزون علاقے میدرے ڈی
ڈیوس میں پروش پانے والی نتالی کینلیس کا کہنا ہے کہ اگرچہ بہت سے لوگ اس درخت
کو نہ جانتے ہوں لیکن اس سے نکالی جانے والی ایک دو انسانی تاریخ میں لاکھوں
جانیں بچائی ہیں۔ کینلیس ڈنمارک کے نیچرل ہسٹری میوزیم میں ماہر حیاتیات ہیں اور
وہ سکونا کی جینیاتی تاریخ پر تحقیقات کر رہی ہیں۔ کمیابی کے شکار اس پیڑ سے میریا کی
پہلی دوا کو نین بنائی گئی تھی۔ سینکڑوں سال قبل کو نین کی دریافت کا دنیا نے پر جوش انداز
میں خیر مقدم کیا تھا لیکن اس کے متعلق شکوک و شبہات بھی تھے۔ اسی دوا پر حال ہی میں
ایک بار پھر سئی بحث شروع ہو گئی ہے۔ کو نین کے مصنوعی ورثن کلور کو نین اور
ہائیڈرول آکسی کلور کو نین کو کورونا وائرس کا ممکنہ علاج بتایا گیا ہے لیکن اس پر تنازع فی
الحال جاری ہے۔ مچھروں کی مختلف اقسام کے کامنے سے ہونے والی بیماری میریا نے
صدیوں سے انسانوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ اس نے سلطنت روما کو تباہ کر دیا تھا اور
20 ویں صدی میں 15 سے 30 کروڑ افراد میریا سے ہلاک ہو گئے۔ عالمی ادارہ



بُرطانیہ اور ڈچ حکومتیں اپنی کالونیوں میں سکونا کے درخت لگانا چاہتی تھیں تاکہ جنوبی امریکہ پر انحصار کم ہو سکے، لیکن صحیح فتح کا انتخاب آسان نہیں تھا۔ سکونا کی 23 اقسام تھیں اور ان میں کوئین کی مقدار مختلف تھی۔ اس کام میں بنا تاتی معلومات کے حامل مقامی قبائل کیوں نے ان کی مدد کی۔

انڈیا میں سنگونا کے درخت

سنہ 1850 کی دہائی میں انگریز جنوبی ہند میں سکونا کے درخت لگانے میں کامیاب رہے جہاں ملیریا کا بہت زیادہ خطرہ تھا۔ برطانوی حکام نے جلد ہی فوجوں اور سرکاری ملازمین کو مقامی طور پر تیار کوئین دینا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کوئین کا ذائقہ بڑھانے کے لیے اس میں جن ملادیا۔ اس طرح پہلے ٹانک واٹر اور جن اور ٹانک ڈرنک کی ایجاد ہوئی۔ آج بھی ٹانک واٹر میں کوئین کی تھوڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ لیکن کتاب جست دی ٹانک، کے شریک مصنف کم اک راس کہانی کو فسانہ سمجھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے با آسانی دستیاب چیزوں کا اس میں اضافہ کیا، چاہے وہ رم ہو، برانڈ یا یا عرق ہو۔ سلیکن ہاف کا کہنا ہے کہ جسم میں کوئین کی عمر کم ہوتی ہے، لہذا اس کو جن یا ٹانک کے ساتھ پینا ملیریا سے تحفظ کی خصانت نہیں ہو سکتا۔ ان سب کے باوجود ملیریا کی روک تھام میں جن اور ٹانک کا فسانہ جاری رہا۔ نوٹن چرچل نے مبینہ طور پر کہا تھا اس مشروب نے جتنے انگریزوں کی جان بچائی ہے اتنی جانیں سلطنت کے تمام ڈاکٹروں نے مل کر بھی نہیں بچائی۔

کوئین والے مشروب

لاشبے جن اور ٹانک فیورٹری سے وابستہ صرف ایک مشروب ہے۔ آج پیرو میں سب سے مشہور کاک ٹیل پسکو ساور ہے جسے امریکیوں نے بنایا تھا۔ لیکن پیرو کے لوگوں میں سب سے زیادہ مقبول ڈٹر ہے، جو کوئین کے ذائقے والا پسکو ٹانک ہے۔ یہ ایک دلیس دریافت ہے جو اکثر اینڈریز کے میز موراؤ (ارغوانی مکنی) کے ساتھ ملا کر پسکو موراؤ ڈٹانک بنایا جاتا ہے۔ کمپری، پمز یا فرانسیسی لیلیٹ (جنیز بانڈ کی مشہور ویسپر مارٹینی کا ایک اہم جز) میں بھی کوئین کا ذائقہ ہوتا ہے۔ یہ سکاٹ لینڈ کے ارن براؤ اور ملکہ الز بھ دوم کے پسندیدہ مشروب جن اینڈ ڈبو نیٹ میں بھی پایا جاتا ہے۔ جنیں اور ڈبو نیٹ دراصل شہائی امریکہ کی کالونیوں میں تعینات فوجیوں کے لیے فرانسیسی کیمسٹوں کے ذریعے تیار کردہ ایک اشتہا انگیز مشروب ہے۔ سنہ 1970 کی دہائی میں آرٹیسین کی دریافت کے بعد کوئین کی طلب میں کمی واقع ہوئی۔ اس کے باوجود دنیا بھر میں کوئین کا چرچ قائم ہے۔ انڈونیشیا کا 'بان ڈنگ'، آج پیرس آف جاؤ کے نام سے جانا جاتا ہے کیونکہ ڈنچ اس بندرگاہ والے شہر کو دنیا کے سب سے بڑے کوئین مرکز میں تبدیل کر دیا تھا۔ آج انڈیا، ہانگ کانگ، سیناپیون، کینیا اور سری لنکا کے ساحلی علاقوں میں بڑے

کر اسے پاؤڈر بنایا جو آسانی سے ہضم ہو سکتا تھا۔ اسے 'جیسوٹ پاؤڈر' کہا گیا۔ کچھ ہی دنوں میں ملیریا کے علاج کے لیے 'طلسماتی' دوا کے بارے میں یورپ میں شہر ہو گیا۔

کوئین تجارت

سنہ 1640 کی دہائی تک جیسوئٹ نے سکونا کی چھال کو پورے یورپ تک پہنچانے کے لیے تجارتی راستے بنائے۔ فرانس میں کنگ لوئس چہارم کے بخار کا کوئی نین سے علاج کیا گیا۔ روم میں پوپ کے ذاتی معالجین نے پاؤڈر کا معائنہ کیا اور جیسوئٹ کے پچاریوں نے اسے عموم میں مفت تقسیم کیا۔ لیکن اس دوا کو پروٹسٹنٹ انگلینڈ میں شک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ کچھ ڈاکٹروں نے اسے کیتھولک سازش اور پوپ کا زہر، قرار دیا۔ اولیور کرومویل کی موت ملیریا کی وجہ سے ہوئی۔ انہوں نے مبینہ طور پر جیسوئٹ پاؤڈر لینے سے انکار کر دیا تھا۔ بہر حال سنہ 1677 تک رائل کالج آف فریشنر نے سکونا کی چھال کو دوا کی سرکاری فہرست میں شامل کیا جس کے بعد پورے انگلینڈ کے ڈاکٹراس سے مریضوں کا علاج کرنے لگے۔ جب سکونا کا جنون بڑھتا گیا تو یورپی افراد نے مقامی لوگوں کو اس کی چھال نکالنے کے کام پر لگا دیا۔ وہ بارانی جنگل کے اندر جاتے، چھال نکالتے اور اسے پیرو کی بندرگاہوں پر کھڑے جہازوں تک پہنچاتے تھے۔ جب سکونا کی ماگ میں اضافہ ہوا تو سین نے اینڈریز کو دنیا کا دوانغا، قرار دے دیا۔ سکونا کے درخت جلد ہی کمیاب ہونا شروع ہو گئے۔ 19 ویں صدی میں غیر ملکی کالونیوں میں تعینات یورپی فوجیوں میں ملیریا کا خطرہ بڑھا تو سکونا کی قیمتیں بھی بڑھ گئیں۔

فوج کی ضرورت

ملیر یا سچکلش، کے مصنف ڈاکٹر وہن دیب رائے کے مطابق کوئین کی مناسب فراہمی ایک سڑیجگ ضرورت بن گئی تھی۔ مسٹر رائے کا کہنا ہے کہ ”نوا آباد یا تو جنگوں میں شامل یورپی فوجی اکثر ملیر یا کی وجہ سے مر جاتے تھے۔ کوئین جیسی دوانے انھیں زندہ رہنے اور جنگ جیتنے کے قابل بنادیا۔“ ڈچ فوجیوں نے انڈونیشیا میں، فرانس نے الجیریا میں اور انگریزوں نے ہندوستان، جیکا اور پورے جنوب مشرقی ایشیا اور مغربی افریقہ میں اس کا استعمال کیا۔ سنہ 1848 سے 1861 کے درمیان برطانوی حکومت نے کالونیوں میں تعینات فوجیوں کے لیے سکونا کی چھال کی درآمد پر سالانہ 64 لاکھ پاؤ نڈ خرچ کیے۔ شاید اسی لیے مؤرخین نے کوئین کو سامراج کا آله کار کہا ہے جس نے برطانوی سلطنت کو آگے بڑھایا۔ زورخ یونیورسٹی میں ٹریول میڈیسین کی پروفیسر پیٹریسیا سلیگن ہاف نے کہا کہ ”جس طرح آج تمام ممالک کو وہ 19 ویکسین بنانے کی تگ و دو میں ہیں اس وقت کوئین کے لیے بھی ایسی ہی تک و دو جاری تھی۔“ سکونا کی چھال کے ساتھ اس کے بیجوں کی طلب میں بھی اضافہ ہوا۔ دیب رائے کا کہنا ہے کہ



خودی کارا زدال ہو جا۔۔۔!

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز دال ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انسان کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زبان ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلوہہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرشاش ہو جا
خود میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقة شام و سحر سے جاؤ داں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنسیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند روکوہ و بیباں سے
گستاخ راہ میں آئے تو جوئے لغہ خواں ہو جا



اشتہارات کے لیے

رسالہ مہنامہ لاہور انٹر نیشنل کو پاکستان اور دنیا بھر سے لاکھوں
قارئین مطالعہ کرتے ہیں یہ پرنٹ کے علاوہ آن لائن ویب
سائٹ پر بھی موجود ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہوں
اپنے اشتہارات شائع کرو کر مقامی طور پر اپنی کمپنی کی تشهیر،
مشہوریت کر سکتے ہیں معلومات کیلئے آپ ہمارے نمائندگان اور
ادارہ سے براہ راست رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاہور
انٹر نیشنل یو ٹیوب چینل کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ تمام
معلومات اس رسالے میں موجود ہیں شکر یہ۔

<http://www.youtube.com/channel/>

UCwM31ueU85MOWeH0UBFhMYw

پیمانے پر انگریزی بولی جاتی ہے۔ اسی طرح مراکش، تیونس اور الجیریا میں فرانسیسی بولی
جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ کو نین بھی ہے۔ آج بھی ہسپانوی زبان میں ایک کہاوت
موجود ہے جس کا مطلب "کو نین سے بھی کڑوی بات" ہے۔

کو نین سے کمائی

سنہ 1950 کی دہائی میں جب کو نین کے لیے علمی سطح پر مقابلہ تھا تو پیر و اور بولیویا
دونوں نے سکونا کی چھال کی برآمد پر اجارہ داری قائم کر لی۔ درحقیقت تاریخی مرکز لا
پاز، نیوکلائیکل کی تھیڈرل اور پلازہ سے بھرے بھرے شہر کے تاریخی مرکز میں
کو بلسوں کی سڑکیں سکونا کی چھال کی کمائی سے بنی تھیں۔ ایک بار بولیویا کے کل ٹیکس
میں سکونا کا حصہ 15 فیصد تھا۔ صد یوں تک جاری سکونا کی چھال کی ماگنگ اس کے
جنگلات کو تباہ کر دیا۔ سنہ 1805 میں اکیواؤور کے اینڈیز میں 25 ہزار سکونا درخت
تھے۔ اب اس جگہ پوڈکارپس نیشنل پارک ہے، جہاں سکونا کے صرف 29 درخت باقی
ہیں۔ کلینس کا کہنا ہے کہ کو نین سے مالا مال اقسام کو انڈیز سے ہٹانے کے سبب سکونا
کے درختوں کا جنیاتی ڈھانچہ بدل گیا۔

سکونا کا تحفظ

لندن کے رائل بٹنیکل گارڈن کے تعاون سے کلینس نے میوزیم میں رکھی پرانے
سکونا کی چھال کے نمونوں کا مطالعہ کیا تاکہ معلوم کیا جاسکے کہ انسانوں کی وجہ سے
درختوں میں کیا تبدیلیاں رونما ہو سکیں۔ وہ کہتی ہیں کہ "ہمارا خیال ہے کہ زیادہ استھان
کی وجہ سے سکونا کی چھال میں کو نین کی مقدار کم ہو گئی ہو گی۔ حال ہی میں علمی ادارہ
صحت نے حفاظتی وجوہات کا حوالہ دیتے ہوئے کرونا وائرس کے مکمل علاج کے طور پر
کو نین کے مصنوعی ورثن ہائیڈرو آسی کلورو کوئن کے مطالعہ پر پابندی عائد کر دی
ہے۔ اگرچہ اب یہ دو اور ختوں کی چھال سے نہیں بلکہ لیبارٹری میں تیار کی جاتی ہے پھر
بھی کلینس کا کہنا ہے کہ مستقبل میں نئی دواؤں کی دریافت کے لیے سکونا اور دنیا کے
دواخانے، کا تحفظ ضروری ہے۔ حکومتیں سکونا کے تحفظ کے لیے کچھ نہیں کر رہی ہیں لہذا
کچھ مقامی گروپوں نے یہ کام شروع کیا ہے۔ سنہ 2021 میں پیرو کی آزادی کے
200 سال مکمل ہونے پر سیمیلا بینڈیٹا نامی ایک ماحولیاتی تنظیم نے 2021 سکونا
درخت لگانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ سلیگنہاف کو امید ہے کہ اینڈیز کے حیاتیاتی تنوع کو
بچانے کے لیے مزید کوششیں کی جائیں گی۔ وہ کہتی ہیں کہ کو نین کی کہانی بتاتی ہے کہ
حیاتیاتی تنوع اور انسانی صحت ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ "لوگ درختوں کو متبادل دوا کا
ذریعہ سمجھتے ہیں جبکہ طبی تاریخ کی کچھ اہم دوائیں ہمیں درختوں سے ملی ہیں۔"
(بیکریہ بی بی سی)





قربانی کی روح اور مذہبی دہشت گردی

تحریر ابن قدسی

ہیں۔ جب محبت اللہی تمام جنبدوں سے بڑھ جاتی ہے تو منزل کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اسی محبت اللہی کے نتیجہ میں شیطان اور شیطانی اعمال سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اسی نفرت سے محبت اللہی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے۔ شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر محبت کا جذبہ بہت مضبوط بنایا ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ منزل ملتی ہے۔ شاید اسی لیے شیطان بھی محبت کے جذبہ کو استعمال کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان دوری پیدا کرتا ہے۔ یہ بہت ہی نازک مسئلہ ہے اور اس مسئلہ کو ناسخہ کے نتیجہ میں مذہب کی دنیا میں خون خراہ اور تلواریں نکل آتی ہیں۔ شیطان محبت اللہی کے جذبہ میں حصہ بھی نہیں۔ انسان کے اندر دوجذبے پائے جاتے ہیں بلکہ ان کو وحیتوں کا نام دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ان کا صحیح استعمال انسانیت کی معراج تک پہنچا دیتا ہے لیکن ان کا غلط استعمال پستی کی اتاء گہرائیوں میں پہنچا دیتا ہے۔ اس میں ایک جذبہ محبت اور دوسرا جذبہ نفرت ہے۔ محبت انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ یہ ایسا جذبہ ہے جس کی تسکین کے لیے انسان ساری عمر محنت و مشقت کرتا ہے۔



پہلو کو جانا ضروری ہے۔ ہاتھیل اور قاتل کی قربانی کا ذکر کچھ ان الفاظ میں ہے۔
وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأً أَبْقَى آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُبْرَيْنَا فَتَقْرِبُ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقْبَلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَا تَقْتُلْنِكَ قَالَ إِنَّنِي أَتَقْبَلُ إِلَيْكَ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (28) لَيْسَ بَسْطَتِ إِلَيْكَ يَدُكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِي إِلَيْكَ لِتَقْتُلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ (29) إِنِّي أُرِيدُ أَنْ تَبُوءَ بِإِلَيْشِ فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ وَذَلِكَ جَرَاءُ الظَّالِمِينَ (30) فَطَوَّعَتْ لَهُ نَفْسُهُ قُتْلَ أَخِيهِ فَقَتَلَهُ فَأَضَبَّهُ مِنْ أَخِيهِ قَاتَلَ يَا وَيْلَتَا أَعْجَزْتُ أَنْ أَكُونَ مِثْلَ هَذَا الْغَرَابِ فَأُوَارِيَ سَوْءَةَ أَخِيهِ فَأَضَبَّهُ مِنَ النَّادِمِينَ (32) (المائدہ 28-32)

اور ان کے سامنے حق کے ساتھ آدم کے دو بیٹوں کا واقعہ پڑھ کر مناجب ان دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قبول کر لی گئی اور دوسرا سے قبول نہ کی گئی اس نے کہا میں ضرور تجویز تھیں کروں گا (جو با) اس نے کہا یقیناً اللہ متقوں ہی کی (قربانی) قبول کرتا ہے۔ اگر تو نے میری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا تاکہ تو مجھے قتل کرے (تو) میں (جو با)

اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربانی کرنے کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنا ابن آدم کی تاریخ۔ قرآن کریم نے قربانی کی اس تاریخ کو محفوظ کیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہاتھیل اور قاتل کی قربانی کا تفصیل ذکر کر کے قربانی کی اصل حقیقت اور اس کے فلسفہ بیان فرمادیا ہے۔ اسی کے ساتھ بعض بنیادی نفسیاتی مسائل، ان کا حل اور معاشرتی امن کے اصول بھی بیان کر دیے۔ آخری شرعی کتاب میں اس واقعہ کا ذکر ہونا ہی اس کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ اس واقعہ میں انسان کی انسانیت کو صحیح راستے پر ڈالنے کے لیے کئی ایک باتیں موجود ہیں۔ انسان کے اندر دوجذبے پائے جاتے ہیں بلکہ ان کو وحیتوں کا نام دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ان کا صحیح استعمال انسانیت کی معراج تک پہنچا دیتا ہے لیکن ان کا غلط استعمال پستی کی اتاء گہرائیوں میں پہنچا دیتا ہے۔ اس میں ایک جذبہ محبت اور دوسرا جذبہ نفرت ہے۔ محبت انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ یہ ایسا جذبہ ہے جس کی تسکین کے لیے انسان ساری عمر محنت و مشقت کرتا ہے۔

س جملہ میں "تسکین" اور "محنت و مشقت" میں بہت تنوع پایا جاتا ہے۔ محبت کی تسکین کے سامان مختلف ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچے کی محبت کی تسکین ماں کی لوری سے ہو جاتی ہے۔ ماں کی پر خلوص محبت سے ادا کئے گئے چند جملے پاک صاف فطرت پر تسکین کا گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ انسان کا جذبہ محبت پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنی تسکین کے سامان بھی بدلتا ہے۔ دوستوں کی دوستی اچھی لگتی ہے۔ چاہنا اور چاہے جانا محبت کے جذبہ کو پروان چڑھاتے ہیں۔ صنف مخالف میں بھی جذبہ محبت کی تسکین محسوس ہوتی ہے بلکہ یہ صورت تو بعض اوقات کافی مضبوط ہو جاتی ہے لیکن یہ ہوتی عارضی ہی ہے۔ کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تسکین گزرے ہوئے کل کا حصہ بن جاتی ہے اور جذبہ محبت مزید تسکین کی تلاش میں نکل جاتا ہے کیونکہ سانسوں کا دوام انسان کے جذبہ محبت کے ساتھ اس کی سوچ اور فکر میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح جذبہ نفرت بھی اپنی تسکین کے متنوع سامان رکھتا ہے۔ جذبہ نفرت کی سب سے خطرناک کیفیت حسد اور بغضہ ہے۔ اس کیفیت میں انسان انداھا ہو جاتا ہے اور بعض اوقات یہی کیفیت پستی کی گہرائیوں تک لے جاتی ہے۔ مذہبی اور روحانی عالم میں بھی یہی دوجذبے محبت اور نفرت بڑا ہم کردار ادا کرتے

بھائی کا صرف یہ قصور تھا کہ وہ مقنی تھا اس لیے اللہ تعالیٰ کو پسند تھا۔ بڑے بھائی کو اپنی اصلاح مشکل نظر آئی اور مقنی بھائی کا قتل آسان لگا۔ لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ محبت الہی کا صرف نام تھا اس کے پیچھے خود غرضی، خود پسندی، انا نیت وغیرہ کی پرستش تھی۔ بھائی بتا بھی رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خالص محبت پسند ہے وہ مقنی کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ بڑے بھائی کے بغض اور حسد نے اس کے دماغ پر قبضہ کیا ہوتا ہے اس کو یہ بات سمجھ نہیں لگتی۔ ظاہر ہے شیطان کبھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی خالص محبت الہی کرے اس لیے وہ کوشش کرتا ہے کہ لوگوں کو ان کے کام خوبصورت کر کے دکھائے۔ انسان جس قدر بغض و حسد میں بڑھتا ہے۔ شیطان اس کی انا نیت، خود پسندی اور خود غرضی کو بڑھاتا جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان کو اپنے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ وہ برداشت ہی نہیں کرتا کہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ شیطان انسان کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی کمزوری کو اس واقعہ میں بیان کیا گیا ہے۔ قابیل نے قربانی قبول نہ ہونے کی وجہ باقیل کو سمجھا حالانکہ قابیل کی اپنی کمزوری اور کوتاہی کی وجہ سے قربانی قبول نہیں ہوئی۔ مقنی بننے میں روک خود اس کا اپنا نفس تھا۔ اسی نفس نے قابیل کو مذہبی دہشت گردی پر ابھارا اور اس نے اپنے مقنی بھائی کو قتل کر دیا۔ قتل اس کے نفس نے اسے خوبصورت کر کے دکھایا۔ جیسے آج بھی مذہبی دہشت کی نظر باطن پر ہوتی ہے۔ ظاہری قربانی بھی اسی کی قبول ہوتی ہے جس کا باطن اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہو۔ اللہ تعالیٰ قربانیوں کا مضمون بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

یقیناً میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام بھانوں کا رب ہے۔

واقعہ کا یہ حصہ ایمانیات کی معراج کو بیان کر رہا ہے۔ مقتول بھائی بھی ہاتھ اٹھا سکتا تھا۔ اپنے بھائی کو قتل کر سکتا تھا لیکن اس نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس نے دنیا کی اس عارضی زندگی کے بد لے رب العالمین کو مقدم کیا۔ اللہ تعالیٰ کے ڈر کو اہمیت دی۔ اسی ایمان کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کو پسند آیا تھا اور اس کی قربانی قبول کی گئی تھی۔ یہاں ان مذہبی دہشت گروں کے لیے بھی سبقت ہے۔ وہ اپنی طاقت یا تعداد کے زعم میں محبت الہی اور محبت رسول کا دعویٰ کر کے کسی پر ظلم کرتے ہیں اگر ان کو اس کا جواب نہیں دیا جا رہا تو انہیں سوچنا چاہیے کہ اتنا ظلم کرنے کے باوجود بالمقابل ہاتھ نہیں بڑھایا جا رہا تو کہیں معاملہ رب العالمین کے سپر دتوں نہیں ہو گی۔ مظلوم اللہ تعالیٰ کے ڈر کو مقدم رکھ رخا موش ہو گیا ہے اور اس نے اپنی نظریں رب العالمین پر لگائی ہوئیں ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ظالم کی دنیا اور آخرت دونوں بر باد ہو گئیں۔ اس واقعہ میں مقنی کی سوچ ملاحظہ کریں وہ اس ظلم کو بھی اپنی آخرت سنوارنے کا ذریعہ سمجھ رہا ہے۔ مقتول بھائی کہتا ہے کہ یقیناً میں چاہتا ہوں کہ تو میرے اور

تیری طرف اپنا ہاتھ بڑھانے والا نہیں تاکہ تجھے قتل کروں یقیناً میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ یقیناً میں چاہتا ہوں کہ تو میرے اور اپنے گناہ اٹھائے ہوئے لوٹے پھر تو اہل نار میں سے ہو جائے اور ظلم کرنے والوں کی بھی جزا ہوتی ہے۔ تب اس کے نفس نے اس کے لئے اپنے بھائی کا قتل اچھا بنا کر دکھایا پس اس نے اسے قتل کر دیا اور وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ پھر اللہ نے ایک کوئے کو بھیجا جو زمین کو (پنجوں سے) کھود رہا تھا تاکہ وہ (یعنی اللہ) اسے سمجھا دے کہ اس طرح وہ اپنے بھائی کی لاش کو ڈھانپ دے وہ بول اٹھاوائے حسرت! کیا میں اس بات سے بھی عاجز آ گیا کہ اس کو ہے جیسا ہی ہو جاتا اور اپنے بھائی کی لاش ڈھانپ دیتا پس وہ پچھتا نے والوں میں سے ہو گیا۔ اب یہ دو بھائیوں کا قصہ ہے لیکن اس میں قیامت تک کے لیے انسانیت کے پر امن معاشرے کے اصول بتاویے گئے۔ دو بھائیوں نے قربانی کی۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی محبت میں کی۔ محبت الہی میں کی گئی دو قربانیوں میں سے ایک بھائی کی قربانی قبول کر لی گئی۔ اب محبت الہی کے دعویٰ کے ساتھ کی گئیں قربانیوں میں سے مقنی کی قربانی کو قبولیت کا شرف ملایا کونکہ اصل چیز تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر باطن پر ہوتی ہے۔ ظاہری قربانی بھی اسی کی قبول ہوتی ہے جس کا باطن اللہ تعالیٰ کی محبت سے لبریز ہو۔ اللہ تعالیٰ قربانیوں کا مضمون بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

لَنْ يَئِنَّ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلِكُنْ يَئِنَّالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ گَذِيلَ سَخْرَهَا لِكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَى أَكُمْ وَلَيَقْتُلُ الْمُحْسِنِينَ (الحج 38)

ہرگز اللہ تک نہ ان کے گوشت پہنچیں گے اور نہ ان کے خون لیکن تمہارا تقویٰ اس تک پہنچے گا اسی طرح اس نے تمہارے لئے انہیں مسخر کر دیا ہے تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بنا پر کہ جو اس نے تمہیں ہدایت عطا کی اور احسان کرنے والوں کو خوشخبری دے دے۔ اللہ تعالیٰ کو ظاہری گوشت یا خون نہیں چاہیے اصل چیز تقویٰ ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، وہ جذبہ محبت جس کا منبع باطن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ڈر جو اسی محبت کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری کسی کوتاہی یا غلطی سے ناراض نہ ہو جائے۔ ہر اس چیز سے نفرت جو اللہ تعالیٰ سے دور لے جائے۔ توبات ہو رہی تھی دو بھائیوں کی قربانی کی۔ مقنی کی قربانی قبول کر لی گئی۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ باقیل چھوٹا بھائی تھا اور قابیل بڑا بھائی۔ باقیل کی قربانی قبول کر لی گئی تو بڑے بھائی کو غصہ آیا کہ اس کی قربانی کیوں قبول نہیں کی گئی۔ محبت الہی میں کی گئی قربانی قبول نہیں ہوئی تو بھائی اس کے کہ بڑا بھائی اس بات پر غور کرتا ہے اللہ تعالیٰ جو دلوں کے حال جانتا ہے اس نے چھوٹے بھائی کی قربانی قبول کر لی میری کیوں نہیں۔ اور وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا، اپنی محبت الہی کو خالص کرتا تقویٰ کے حصول کے لیے کوشش کرتا، بڑے بھائی نے دوسرا استہانیا۔ وہ راستہ جس پر آج کل زیادہ تر انسانیت روای دواں ہے۔ یعنی محبت الہی کا نعرہ لگا کر دہشت گردی کرنا۔ بڑے بھائی قابیل نے چھوٹے بھائی باقیل سے کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ چھوٹے

آئیں گے ہم

..... ریاض اکبر، آسٹریلیا

یہ لکھتے رہنا

کہ ہم وہ اہل کہف ہیں جنکے تمام سے
بنے ہیں سونے کو تاب دینے پر کندنوں سے
یہ ہر طرح کھوٹ سے مبرہ
کہ عصر بھی ان کی قدر و قیمت گھٹانا نہ پائے
کہ ان پر مہر وفا لگی ہے

یہ لکھتے رہنا

عینیت غاروں میں بیش قیمت گہر ترش کے
پر دئے ہم نے وہ ہار جنکو پہن کے نکلے
محبتوں کے عظیم فاتح
کہ نفرتوں کے غنیم جنکو ہرانہ پائے
کہ رزم گاہِ دعا کڑی ہے

یہ لکھتے رہنا

تمہارے شہروں کے رنگ گرفتار خوف نے اڑائے
جو زرد چہروں پر ٹھیکی آنکھیں سی چینتی ہوں
کہ راستہ تک نظر نہ آئے
تو ہم یہ غاروں کے رہنے والے
تمام سچائیوں کے ہمراہ
نکل کے آئیں گے تم سے ملنے، سہار دینے
ہم اپنی سوچوں کے صاف سکوں کی نعمگی سے
یا آنسوؤں کے گہر کی شفاف جھملی سے
لہو سے اپنے فضا کو رنگین کر چلیں گے

یہ لکھتے رہنا کہ آئیں گے ہم



اپنے گناہ اٹھائے ہوئے لوٹے مقتول بھائی اس ظلم کو اپنے گناہ مٹانے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔
اور دوسری طرف قاتل بھائی کے نفس نے ظلم کو اچھا کر کے دکھایا۔ تب اس کے نفس نے
اس کے لئے اپنے بھائی کا قتل اچھا بنا کر دکھایا پس اس نے اسے قتل کر دیا اور وہ نقصان
اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔

بظاہر دنیاوی اعتبار سے قاتل بھائی کا میا ب ہو گیا۔ اس نے اپنے نفس کی تسلیم کا
سامان کر لیا۔ محبت الہی کا دعویٰ کر کے مقتول بھائی کی سانسیں ختم کر دیں۔ یہ حق کامیابی
حقیقی کامیابی سے کسوں دور ہے۔ اصل نقصان اٹھانے والا قاتل بھائی آخرت کی نعمتوں
سے محروم ہو گیا۔ آخرت پر نظر رکھنے والوں کے لیے دنیاوی نقصان کوئی معنی نہیں رکھتا۔
حقیقی کامیابی اور حقیقی مقصود تو مرنے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ مقتی ہمیشہ اس حقیقی
کامیابی و مقصود پر نظر رکھتا ہے۔ لیکن دنیا میں یہ مذہبی دہشت گردی انسانیت کو اتنا نیچے گرا
دیتی ہے کہ جانوروں چند پرندے سے بھی ادنیٰ کر دیتی ہے۔ انسان تہذیب و تمدن سے بہت
دور چلا جاتا ہے۔ اس واقعہ میں ذکر ہے کہ قاتل بھائی کو تہذیب ایک کوئے کے ذریعہ
سکھائی گئی۔ پھر اللہ نے ایک کوئے کو بھیجا جو میں کو (پنجوں سے) کھود رہا تھا تاکہ وہ (یعنی
اللہ) اسے سمجھا دے کہ کس طرح وہ اپنے بھائی کی لاش کو ڈھانپ دے وہ بول اٹھاواۓ
حرست! کیا میں اس بات سے بھی عاجز آ گیا کہ اس کوئے جیسا ہی ہو جاتا اور اپنے بھائی
کی لاش ڈھانپ دیتا پس وہ پچھتا نے والوں میں سے ہو گیا۔ انسانیت کے رخصت ہونے
کے بعد پچھتا نے کے علاوہ اور رہ کیا جاتا ہے۔ اب مذہبی دہشت گردی کرنے والوں کے
لیے سوچنے کا مقام ہے کہ جس مذہب کی محبت میں وہ انتہائی قدم اٹھاتے ہیں۔ کلمہ کو مٹانے
سے لے کر اذان کی آواز روکنے تک، قبروں کے کتبے توڑنے سے لے کر گھروں کو
بر باد کرنے تک، مندر کی تعمیر رونکنے سے لے کر چرچ گرانے تک، دل کو زخمی کرنے سے
لے کر سانوں کو قتل کرنے تک اگر ان کو یہ زعم ہے کہ اس طرح وہ مقتی بن جائیں گے۔ ان
کا پیدا کرنے والا ان سے راضی ہو جائے گا تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ اگر پیدا کرنے
والا چاہتا کہ سب ایک ہی راستے پر چلیں اور اپنی سوچ اور سمجھ سے درست راستے کا انتخاب
کرنے کی صلاحیت نہ رکھیں تو سب کو ایک ہی مذہب پر پیدا کر دیتا۔ زور زبردستی کا سب
سے زیادہ اختیار تو پیدا کرنے والے کو ہے۔ لیکن وہ چاہتا ہے کہ انسان سوچ سمجھ کر جس
راستے کو ٹھیک سمجھے، اختیار کرے۔ باقی جو غلط راستے پر ہو گئے ان کے لیے جہنم تیار ہے صحیح
راستے والے جنت میں جائیں گے۔ جہنم کو بھرنے کا ٹھیک انسانیت کو نہیں دیا گیا کہ انسان
فیصلہ کرے کہ فلاں جہنمی ہے اور اسے جہنم میں بھونا اس کی ذمہ داری ہے۔ یہ کام اللہ تعالیٰ
کا ہے۔ انسان کو اس کے کاموں میں دخل اندازی کی اجازت نہیں ہے۔ محبت الہی کا تقاضا
ہے کہ اللہ کے کام اللہ کو ہی کرنے دیں اور جو کام انسانوں کے کرنے والے ہیں وہ انسان
ہی کریں۔ ورنہ انسانیت کو سوائے شرمندہ ہونے کے اور کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اللہ کی محبت
کا نعرہ لگا کر نفرت کا کاروبار ہمیشہ گھائٹے کا سودا رہا ہے۔



قوموں کی تباہی کے محركات میں سے ایک محرك

تحریر: شیخ عبدالوکیل (کوئٹہ)



ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے اب انہیں عاقلوں کی نسلیں اپنے آباء پر ہونے والی زیادتیوں کا مدوا کچھ یوں کرتی ہیں کہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنا چھوڑ دیتی ہیں کیونکہ وہ دیکھ چکتی ہیں کہ صلاحیتوں اور قابلتوں کے ہوتے ہوئے اخلاص و وفا کا دم

بھرنے کے باوجود ان کے آباء محض اپنی زندگیاں تکالیف اور جاہلوں کے تصرف میں بس رکھ لے چکے ہیں، اب نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چونکہ جن کے ہاتھ میں انصرام حکومت ہوتی ہے وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنی عقل کے تحت کوئی کام کر سکیں اور جیسی روح ویسے فرشتے نہ ہی ان کے تحت وہ نہ اہل لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ کام کو سنبھال سکیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قویں تباہی کی طرف جانا شروع ہو جاتی ہیں اور تباہی کی طرف ان کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اس کا رکنا یا اس کو روکنا اب ناممکنات میں ہو جاتا ہے اور پھر انسان جو

* {کَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرًا شَيْءٍ جَدَلًا} (الفہد 55)* میں اسان ہر چیز سے زیادہ جھگڑا لو ہے اس تمام صورت حال کا ذمہ تقدیر کے نوشتؤں پر ڈال دیتا ہے اور پھر چار ناچار خود کو معتبر کرنے کے لیے راضی بقضاء کا دم مارنے اور اپنی تمام تر ناکامیوں کا ملبہ خدا تعالیٰ کے نوشتؤں پر ڈالنے کے لیے یا تو تاریخ کی مثالیں سامنے لے آتا ہے یا چار ناچار ایسی پیشگوئیاں نکالنے لگ جاتا ہے کہ یہ تو تقدیر کا لکھا تھا جبکہ جانتے ہیں کہ تقدیر کا لکھا اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے، اور انذاری پیشگوئیوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال میں درستی پیدا کر کے مختلف قسم کی بلاوں سے اپنے تیس بچا سکے اور جن بیش انعام و اکرام کے وعدے خدا تعالیٰ نے انسان سے کیئے ہوتے ہیں ان کا حصول خدا تعالیٰ کے قانون {أَوْفُوا بِعَهْدِكُمْ} (البقرة 41) یعنی میرے عہد کو پورا کرو، میں بھی تمہارے عہد کو پورا کروں گا۔ اب ان ہی عہدوں میں ایک عہد وہ آیت بھی ہے اگر غور کیا جائے جس کی بنا پر مضمون شروع کیا گیا تھا کہ امانتیں ان کے حقداروں کے سپر دکرو۔

دنیا میں اگر دیکھا جائے تو سب سے بڑا عہدہ درحقیقت باشناہت کا ہوتا ہے اور پھر تمام عہدے اس کے ذمیل میں آتے ہیں توجہ خدا تعالیٰ نے اس عہدہ کے حقیقی حقدار کا ذکر کرتے ہوئے جو نشانیاں بتائی ہیں جن کا ذکر خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک نبی اور اس کے مخالفین کی زبانی درج کر دیا جیسا کہ وہ فرماتا ہے * {وَقَالَ رَهْمُ
نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَاتَلُوا أَنَّمِيَّةً يَكُونُ لَهُ الْبُلْكُ عَلَيْنَا وَنَخْنُ

اس موضوع پر مختلف پیرايوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لکھا جاتا رہا ہے مختلف واعظوں نے اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق وعظ بھی کہے یہ مضمون اپنی ذات میں ان کے سامنے مخفی سورج کو چاند لکھانا ہے مگر بقول اقبال کہ

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات
گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد اور مختلف کتب تاریخ پر نظر ڈالنے کے بعد اور سب
سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کریم کی اس آیت کو دیکھ کر جس میں خدا تعالیٰ نے حکماً ایک بات کا
اطھار کیا کہ: *إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤْدُوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ
النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعُدْلِ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعْظُمُ بِهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا
(النساء، 59)

(ترجمہ) یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اماتتیں ان کے حقداروں کے سپر دکیا کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان حکومت کرو تو انصاف کے ساتھ حکومت کرو یقیناً بہت ہی عمدہ ہے جو اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے یقیناً اللہ بہت سننے والا (اور) گہری نظر رکھنے والا ہے۔

اب اس آیت کریمہ میں جو حکم دیا گیا اس کی دو شاخیں ہیں ایک کہ امانتیں ان کے
حداروں کے سپرد کیا کرو اور دوسرا حکم یہ کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ کیا جائے تو عدل کے
ساتھ فیصلہ کیا جائے۔ نہایت ہی افسوس کی بات یہ کہ جب امانتیں حداروں کے سپرد
نہیں کی جاتیں تو کبھی بھی ایسا نہیں ہوتا کہ فوراً ہی آسمان سے بچلی گری ہو بلکہ اس افسوس
سے بھی بڑھ کر افسوس یہ کہ بچلی گرنے کا یہ عمل آسمان پر شروع ہو جاتا ہے اور پھر وقت
معینہ پر بچلی ایسے وقت میں گرتی ہے جب ہم سوچتے ہیں معاملات تو بالکل درست سمت
پر گامزن تھے مگر ہوتا کچھ یوں ہے کہ جب امانتیں ان کے حداروں کے سپرد نہیں کی
جاتیں تو اس وقت ایسے صابر لوگ اور ایسے اطاعت شعار لوگ تختہ مشق بن رہے ہوتے
ہیں جن میں ان معاملات کو برداشت کرنے کی قوت بھی ہوتی ہے اور مقدرت بھی مگر
ایک نسل بعد یادو نسلیں بعد ایسے لوگ آجاتے ہیں کہ جب ان کو یہ معاملات پڑتے چلتے ہیں
تو وہ یکسر ان چیزوں سے دل برداشت ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ وہ کام جو جاہلوں کے
زمانہ میں عاقل ان کے تحت رہتے ہوئے بھی کرتے ہیں اور چونکہ معاملات یکسر تبدیل

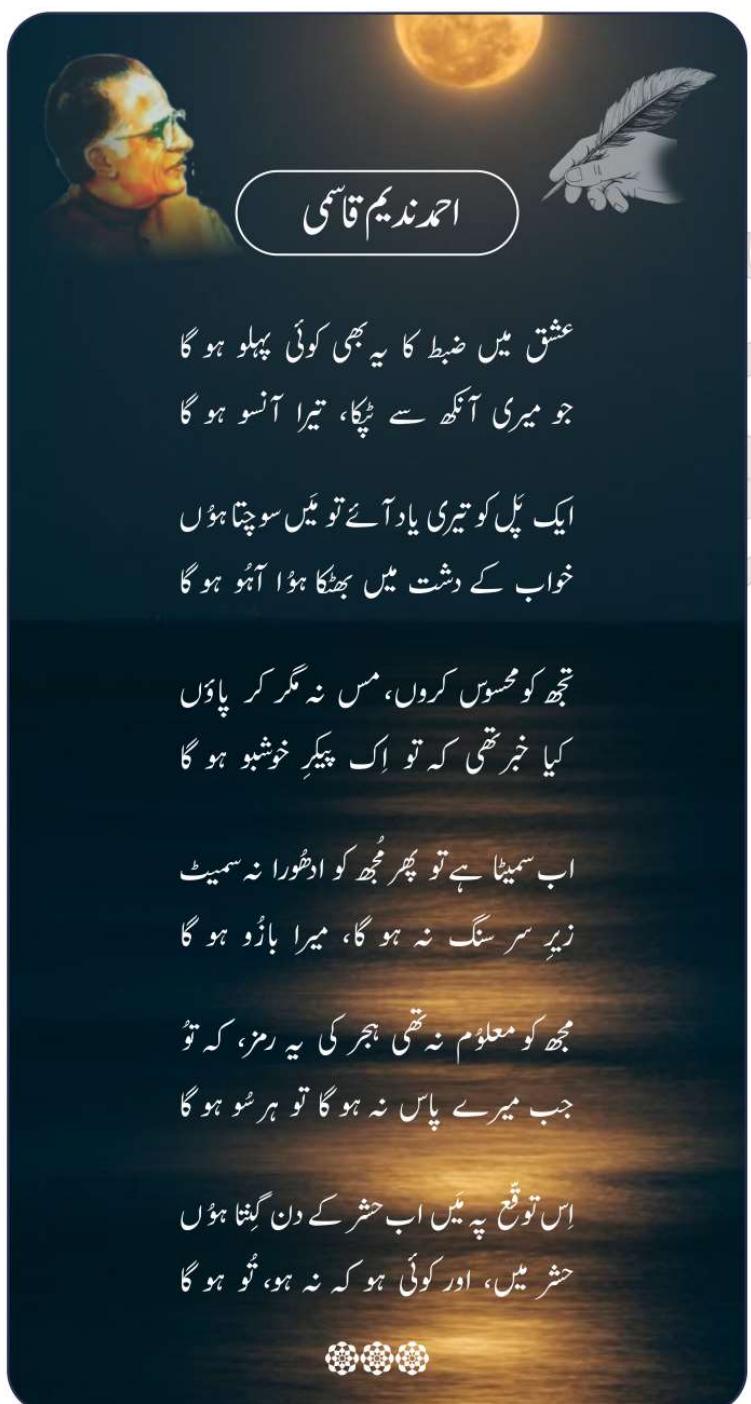
تمام مذاہب، تمام ملقوں، تمام قوموں، تمام فرقوں، تمام ذاتوں اور تمام زمانوں نے
بے نیاز ہے اس لیے اگر کوئی شخص یا گروہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم ایسی باتوں سے مستثنی ہیں تو
درحقیقت یہ اس کی خام خیالی ہے اور ایک نایک دن اس کی نسل یا آنے والا مورخ
ضرور اس کی اس غلطی پر شاہد ناطق بن کر سامنے آجائے گا مگر یہ ایک ایسی چیز ہوگی جو
ایسے ہی ہے کہ اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چک گئیں کھیت یا پھر سانپ کی
لکیریں پینٹے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اس لیے دانا میں اسی میں ہے کہ ان معاملات کو غور
سے دیکھا جائے، سمجھا جائے، اس کے پہلوں پر نظر عین ڈالی جائے اور پھر عمل بھی کیا
جائے کیونکہ میں دانا میں بھی یہی حقیقت ہے کہ انسان پہلی قوموں کے حالات سے
فائدہ اٹھائے اور وہ غلطیاں نہ دہرائے جس سے قوموں کی قومیں تباہ ہوئی ہوں خواہ
وہ تباہی دنیاوی ہو یا مذہبی قومی ہو یا انفرادی۔

أَحَقُّ بِالنِّلْدِكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ النَّبَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكَ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ
بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُوْقِنُ مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلَيْهِمْ

(البقرة 248) اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ یقیناً اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے انہوں نے کہا کہ اس کو ہم پر حکومت کا حق کسے ہوا جبکہ ہم اس کی نسبت حکومت کے زیادہ حقدار ہیں اور وہ تو مالی و سمعت (بھی) نہیں دیا گیا اس (نبی) نے کہ یقیناً اللہ نے اسے تم پر ترجیح دی ہے اور اسے زیادہ کر دیا ہے علمی اور جسمانی فراخی کے لحاظ سے اور اللہ جسے چاہے اپنا ملک عطا کرتا ہے اور اللہ و سمعت عطا کرنے والا (اور) دائمی علم رکھنے والا ہے۔

اب یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں جو بھی کام ہوتے ہیں درحقیقت ان کے پیچے علم کی فراغی اور جسم کی فراغی نہایت ہی ضرورت ہیں اور یہی وہ چیز ہیں جو کسی بھی کام کے کرنے میں درحقیقت کلیدی کردار ادا کرتے ہیں اور ان دو چیزوں کو دیکھنا ہر معاملہ میں نہایت ہی ضروری ہے۔ مگر نہایت افسوس کی بات یہ کہ جب انسان جو خود کو عقل کل سمجھتا ہے اس سے اس معاملہ میں بھی غلطی ہوتی ہے تو وہ اس معاملہ کو بھی آیت کے اس حصہ کو^{*} (وَاللَّهُ يُوقِنُ مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ (ابقرۃ 248)) اور اللہ جسے چاہے اپنا ملک عطا کرتا ہے۔) پیش کر کے خود کو بری الذمہ کرنے کی لاحاصل کوشش کرنے لگ جاتا ہے، جبکہ وہ اسی آیت میں خدا یعنی حکیم کی حکمت کا ذکر ان الفاظ میں سن بھی چکا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے با دشابت جو سپرد کی اس کی وجہ تھی اور وجہ علم اور جسم کی فراغی کو قرار دیا۔ مزید یہ کہ اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ خدا تعالیٰ ہی قرآن کریم میں انسان کرذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ^{*} {لَبِيلِ الْإِنْسَانُ عَلَى نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ وَلَوْ أَنَّقَى مَعَاذِيرَهُ} (القمرۃ 15-16)

(ترجمہ) حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس پر بہت بصیرت رکھنے والا ہے، اگرچہ وہ اپنے بڑے بڑے عذر پیش کرے۔ لیں انسان کا نفس اس کو اس کی جہالت اور اس کی بے انصافیوں پر ملزم تو کرتا ہے مگر ہائے افسوس کے انسان اس دنیاوی زیست کے لیے آخرت کو بھی بھلا دیتا ہے اور نہ صرف آخرت بلکہ اس دنیا میں بھی تباہیوں اور ناکامیوں کے وہ نجح بودیتا ہے جو اپنے وقت پر تنا آورد رخت بن جاتے ہیں جن کا کڑوا پھل ان کو نہیں تو ان کی آنے والی نسلوں کو کھانا ہی پڑتا ہے، اور افسوس تو یہ کہ اگر کسی کو اس کی غلطی پر اطلاع دے دی جائے تو وہ اپنی غلطی دور کرنے کی بجائے کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اسی شخص کی غلطیاں نکال کر سامنے لے آئے اور اپنے دل کو خوش کر سکے کہ اس نے کمال کر ڈالا مگر یاد رہے کہ یہ فعل اس کو کلیتہ اس معاملہ سے اس کو آزاد نہیں کر سکتا۔ اس حوالہ سے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خدا تعالیٰ کی ذات جیسا کہ



مکرم عبدالکریم قدسی صاحب کا خصوصی انتڑو یو



(لاراټنچې نېټووژن)



سوال نمبر 1: ابتدائی حالات زندگی۔

ہوشیار پوری کے دفتر میں شرقی بن شاکن، یزدانی جالندھری، طفیل ہوشیار پوری اور ایف ڈی گوہر کے مباحث سے ہم لوگ خوب سرشار ہوتے۔ دانش کدہ حضرت احسان دانش کی نشست گاہ تھی۔ وہاں بھی قسمت نے بیٹھے کے بہت سے مواقع عطا کئے۔ شفیق کوئی، رشید کامل، اقبال رائی سے وہیں تعارف ہوا۔ شورش کاشمیری بھی کبھار وہاں آتے تھے۔ ساغر صدیقی کا درویشانہ دربار فٹ پاتھ پر لگتا تھا۔ روزانہ کی حاضری دینے والوں میں میرے علاوہ یونس حضرت امرتسری، ظہیر احمد ظہیر، تو قیر الدھیانوی، یونس ادیب، ناز خیالوی، عبدالستار مفتی اور یاسین رضا شامل تھے۔ طالب حسین طالب اور یوسف مثالی بھی گاہے گاہے شامل ہو جاتے تھے۔ پنجابی حلقوں کے ہیروں کی چک دک بھی دیدنی تھی۔ ایک حلقة میں رووف شیخ، سلیمان کاشر، منظور وزیر آبادی یونس الحقر، اطہر نظامی، معراج دین اختر، ہماں پرویز شاہد اور منتظر زریں۔ دوسرے حلقة میں ڈاکٹر رشید انور، سلطان محمود آشفتہ، سعید جعفری، زاہد نواز، حسین شاد کنول مشتاق وغیرہ۔ ایک حلقة مشتاق بٹ ایڈوکیٹ کا تھا۔ استاد اللہ دستی صابر، قمر الدین کامل، اعزاز احمد آذر، تونیر ظہور، غلیفہ نادم عصری وغیرہ اسی میں شامل تھے۔ استاد دامن سب سے الگ تھلک ایک مجرے میں رونق افزوز رہتے تھے۔

سوال نمبر 5: آج تخلیق ہونے والے ادب کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

جواب: جس طرح پوری غزل میں صرف ایک شعر کام کا ہوتا پوری غزل معتبر کہلاتی ہے۔ اس طرح آج کے کم شل دور میں بھی کچھ نوجوانوں کی تخلیقات حیران کن ہیں جس کی وجہ سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زریخز ہے ساقی۔
سرکاری سریستی میں چلنے والے ادمنی اداروں کی کارکردگی سے مطمئن

جیں۔؟

١٢- تعلیمات کوئی کامپیوٹر نہ نہشیرا

بُواب: سیر ادب سے س وی پون صدی کے حرمسے ل وحیط ہے۔ میں یہ اسرا دبی اداروں کی کارکردگی کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ مجھے آج تک اس بات کی سمجھنیں آئی کہ ان اداروں کے قیام کا مقصد ادب یا زبان کی ترویج و ترقی ہے یا بعض خاص لوگوں کو نوازا ہے جو ان اداروں میں بیٹھے بڑی بڑی قیس ٹھور رہے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ان میں اکثر ادارے دل پنڈے افراد کے ساتھ صرف کتابیں چھانپے کا کام کر رہے ہیں۔ یہ کام اردو بازار کے پبلشرز یادہ بہتر انداز میں کر رہے ہیں۔ وہ کس طرح ادیب اور شاعر کا استھان کر رہے ہیں۔ حقیقت اپنی جگہ یہ رے یکین ان اداروں نے ادیبوں کی بہبود کے

جواب: میں نے 1948ء میں کرتوضع شیخوپورہ میں ایک غریب اور محنت کش گھرانے میں آنکھ کھولی۔ محنت و مشقت نے نہ جانے مجھ میں کیا خوبی دیکھی اور مجھ پر ایسی فریفہتہ ہوئی کہ آج بھی یہ مخاصماتے تعلق اور رشتہ قائم و دامن ہے۔

سوال نمبر 2: شاعری کا آغاز کب اور کیسے ہوا۔

جواب: ریڈیو سے مشاعرے سننے کا شوق تھا۔ لاہور، کراچی، جالندھر، دہلی سے کب مشاعرہ نشر ہوتا ہے۔ مجھے علم ہوتا تھا۔ مشاعروں سے اپنے شعر نوٹ کرتے کرتے اور پسندیدہ شعروں کی تلاش نے خود شعر کہنے کا حوصلہ دیا۔

سوال نمبر 3: پہلی نظم جو لکھی یاد ہے۔

جواب: حمد ماری تعالیٰ تھی۔

نچا نکہ ملگا مجھ کو مسے ایسا عالیاں

نہ جانے کب ملے گا مجھ کو میرا مدعا یا رب
کچھ ایسی ہی تھی

سوال نمبر 4: سماٹھ ستر کی دہائی میں ہونے والے طرحی
مشاعر اور ادیٰ مخلوقوں سے واسطہ کیجھ بادکر

جواہر میں نام نگہداں کیا کرتا

بُدَاب: میں سے اپنی رخوں کی سماں احمد روایہ
کے ابتدائیہ میں ان طرحی مشاعروں اور ادبی محافل کا
تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ کیا شعروشاعری کی ترقی و ترقی کا
سنہری دور تھا۔ ایک طرف حضرت نسٹر جالندھری کا حلقة نشتر

ادب تھا۔ وائی ایم سی میں مشاعرے ہوتے۔ ڈاکٹر بسم رضوانی کا حلقة بہت فعال تھا۔ پہلے پرانی انارکلی میں واصف علی واصف کے

الگاش کالج میں پھر اس بہنڈنگ پھر ریواز گارڈن میں باقاعدگی سے مشاعرے ہوتے۔ نوح ناروی کے شاگرد زیبانا ناروی صاحب بھی باقاعدگی سے مشاعرے

کرشن مگر میں۔ تابکاری روڈ تکنیک اعلیٰ والا میں اصغر شارقیتی کی محفل جلتی۔ ڈاکٹر عبدالرشید
تبسم کے ہاں 103 سی ماڈل ٹاؤن میں بلا نامہ ماہوار طرحی نشست برپا ہوتی۔ اقبال
صلاح الدین اور بشیر منذر کے ڈیرے بھی اہل قلم سے ہمیشہ آبادر ہے۔ اقبال صاحب کے
ہاں بشیر حسین ناظم، چودھری غلام رسول، عبدالجبار شاکر، اشرف پال، ڈاکٹر صدیق
مل، ساقی گجراتی، ریاض راجی، عصمت اللہ زاہد، غلام مصطفیٰ بسل، راجا رسالو، اقبال
زخمی، مقصود ناصر چودھری، سید اسلام شاہ، امین خیال اور بے شمار دیوبوں شاعروں کا آنا جانا
تھا۔ بشیر منذر کا ایک روڈ پر المnar آرت پر لیں تھا۔ وہاں بھی اہل قلم کی بہت ریل پیل رہتی
تھی۔ شریف کنجھا ہی تنویر سپرا، حفظیت تائب، اقبال ساجد، روحی کجا ہی، ڈاکٹر آفتاب نقوی
سلیمان کاشٹر وہاں آتے جاتے تھے۔ ڈاکٹر اجميل نازی سے بھی وہیں تعارف ہوا طفیل

اداروں کو اس کام پر لگا کر ان کی تن آسانی کا عملانج کیا جائے۔

سوال نمبر 12: آج عالمی مشاعرے تو ہور ہے ہیں مگر عام مشاعروں میں کمی کیوں ہے۔

جواب: پہلے ادب کی خدمت کے لئے مشاعرے ہوتے تھے آج حق خدمت کے لئے ہوتے ہیں۔ کمرش ازم کے دھوکیں نے ادب کی خدمت کا چہرہ جھلسا کے رکھ دیا ہے۔

سوال نمبر 13: تاریخ گوئی کو ایک مشکل صنف کہا جاتا ہے۔ بہت سے دوستوں کی تاریخ وفات آپ نے نکالی ہے۔ اس طرف کیسے آئے۔

جواب: میرے ایک شاعر دوست عبدالسلام اختوفت ہوئے میں نے پہلی بار ان کی تاریخ وفات نکالی۔

”آسمانِ شعر کا اختوفت گیا۔“

1975

یزاد فی جاندھری صاحب اس فن میں پیدا طولی رکھتے تھے۔ میں نے ان کو مصرع سنایا۔ وہ چلتے چلتے رکے۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ سر کو ہلا کیا۔ کہنے لگے بالکل ٹھیک مصرع ہے۔ مجھے تھکی دی۔ اور کہا کہ یہ فن مشکل ضرور ہے اور محنت طلب ہے۔ اس راستے پر بڑھتے رہنا ہے اپس نہیں لوٹنا۔ آدمی صدی بعد بھی ان کی تھکی کی حرارت و محبت اور شفقت آج بھی محبوس کرتا ہوں۔

سوال نمبر 14: بطور شاعر آپ اردو یا پنجابی کس میں زیادہ سہولت سے اظہار خیال کرنے میں آسانی سمجھتے ہیں۔

جواب: اردو چونکہ ہماری قومی زبان ہے میں اردو میں لکھنا فخر کی بات سمجھتا ہوں۔ پنجابی چونکہ میری مادری زبان ہے اس لیے مادری زبان میں لکھتے ہوئے محبوس ہوتا ہے جیسے میں کوئی ثواب کا کام کر رہا ہوں۔

سوال نمبر 15: میر و ن ملک کب گئے اور موجودہ ادبی سرگرمیاں کیا ہیں۔ اس بارے میں کچھ بتائیے۔

جواب: میں نے 2013 کو بھیگی پکوں سے مادر گینیتی کو الوداع کہا۔ مسلسل نا انصافی، عدل کشی اور تعصب کی تیز آندھی زوروں پر تھی۔

بھیگی پکیں، پاؤں میں چھالے، ہاتھ میں خشک نوالہ ہے
یہی تماشا دیکھ رہے ہیں جب سے ہوش سنجالا ہے
تاہم میں کسی صورت ملک چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ میرا بیٹا جو امریکہ میں ٹرکوں کے کاروبار سے منسلک ہے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے کہ بڑھاپے میں اولاد سے جان بوجھ کر کنارہ کشی خود کشی سے کم نہیں۔ امریکہ کی بعض ریاستوں کا اتنا فاصلہ ہے کہ کئی کئی کھنے ہوائی سفر میں لگ جاتے ہیں سواہل قلم فون کے ذریعہ ہی مل لیتے ہیں۔ میں ویسے ہی اب مشاعروں سے آنکھ چراتا ہوں کہ میرے کم از کم اردو پنجابی کے گیارہ مسودے تیار پڑے ہیں۔ ان کو ترتیب دینے پر توجہ ہے کہ زمین میں چھپ جانے سے پہلے پہلے یہ چھپ جائیں وگرنہ کل کو کون اشاعت کا سر درد مول لے گا کہ پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں تو اردو پنجابی سے دور جا رہے ہیں ان کا اوڑھنا بچھونا ہی انگریزی زبان ہے۔

لیے کیا کیا ہے؟ مراسم اور تعلقات کی بنا پر انہیلی دے کر غیر معاہدی کتابیں چھاپنے کا عمل جاری ہے۔ اکیڈمی آف لیٹری کوادیپوں کی اعانت اور بہبود کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ یہ ادارہ بھی اپنے مقاصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا۔

سوال نمبر 7: آج کا لیکیشن انک میڈیا ادب کی ترقی و ترویج میں کردار ادا کرتا دھکائی دیتا ہے۔

جواب: نہیں۔ جہاں ایک خوبصورت لڑکی انا و سمونٹ کرے کہ ”خواجہ سرا کی بیماری سے اتنے مریض ہسپتال میں داخل ہیں یافت ہو گئے ہیں۔“ یاد رہے کہ یہ خسرہ کی بیماری کا ذکر تھا۔ موصوفہ نے خسرہ کو خسرہ پڑھتے ہوئے مہذب لہجہ اختیار کیا۔ اب تا نہیں یہ صرف اردو کا نہیں اردو ادب کا جنازہ نہیں ہے؟ اب ہم انا و نسر کی خوبصورتی دیکھیں یا اردو ادب کے جنازہ میں شرکت کریں۔ ہاں چند ایک لوگ ہیں جو علم قسم کرتے ہیں۔ مگر آٹے میں نہک کے برابر

سوال نمبر 8: اہل قلم کو ہر سال دیئے جانے والے اعزازات پر آپ کی رائے۔

جواب: اس کے باوجود کہ سیاست ملوث ہوتی ہے۔ انصاف کا دامن چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میرٹ بھی ذمہ ہو جاتا ہے مگر میں اس کو بند کرنے کے حق میں نہیں۔ دس میں سے ایک ایوارڈ بھی مختلف کوول جائے تو غنیمت ہے۔

سوال نمبر 9: غزل اور نظم میں آپ کی پسند۔

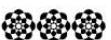
جواب: میری پہلی اور آخری محبت غزل ہے۔

سوال نمبر 10: کس شاعر ادیب نے متاثر کیا۔

جواب: جب ہم نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو ایک سے بڑھ کر ایک ناگہ روزگارہستیاں موجود تھیں جن کی روشنی میں اردو ادب کی دیوی املاک املاک کے چلتی تھی۔ ایک سنبھار اور تھا ادب کا۔ کس کا نام لیا جائے البتہ جن کے قدموں میں بیٹھ کر کسب فیض کیا ان میں شرقی بن شائق، ساغر صدیقی، یزاد فی جاندھری، ثاقب زیرودی، اقبال صلاح الدین، بشیر منذر، ڈاکٹر شید انور اور رفیق شیخ جیسے بلند قامات لوگ تھے۔

سوال نمبر 11: ادب میں تقید و تحقیق کے بارے میں آپ کی رائے؟

جواب: مجھے افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں جس تیزی سے شاعر پیدا ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں اس تیزی سے ہم نقاد اور محقق پیدا نہیں کر سکے۔ نقاد وہ شخص ہوتا ہے جو ادب کی رفتار ہی نہیں ماتبا بلکہ اس کی انگلیاں ادیب اور ادب کی بغض پر ہوتی ہیں۔ وہ معاشرے کی بنتی بگزتی ہوئی صورت حال کا ادراک رکھتا ہے۔ اور ادب کی سمت معین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسی طرح محقق کا وجود بھی ادب کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ محقق اپنی تحقیق کے ذریعہ کھوئے ہوؤں کی جتوح کرتا ہے اور ادب کے گم شدہ آثار دریافت کر کے نئی صورت حال پیدا کرنے کا سامان فراہم کرتا ہے لیکن اب تقید و تحقیق کا میدان خالی ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کے دور کا یہالیہ ہے کہ ہمیں کوئی بڑا نقاد اور محقق نظر نہیں آتا۔ اب وہ لوگ نقاد کا لیبل لگائے ہوئے ہیں جو شعر کو وزن میں نہیں پڑھ سکتے۔ اور محقق یونیورسٹیوں میں جمع ہو گئے ہیں جہاں سندی تحقیق میں وہ دوسروں کے کام پر باتھ صاف کیے جا رہے ہیں۔ ان کی نگرانی کرنے والے اساتذہ بھی بس ایسے ہی ہیں جو تحقیق کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سرکار کی سرپرستی میں چلنے والے ادبی





اردو پڑھانے سے دل ہی اٹھ گیا سجاد

ہے لہذا مرنے کے بعد بخرا اوقیانوس میں شامل ہو جائے گا اور یوں منکر نیکر کی پوچھ چھ سے
پنچ جائے گا، لیکن ایسا ہو گا نہیں کیونکہ آخرت برقن ہے اور جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا اس کا
ٹھکانہ دوزخ ہے۔ اللہ سے ہدایت دے۔ آمین۔۔۔!!!

مقامِ فیض کوئی راہ میں بچا ہی نہیں
جو کوئے پار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ایک سقراط نے اس کو یوں لکھا کہ ”اس شعر میں شاعر کوئے یار سے لمبا سفر کر کے رواں پنڈتی کے ”فیض آباد چوک تک“ پونچا ہے لیکن اسے یہ مقام پنڈ نہیں آیا کیونکہ یہاں بہت شور ہے، شاعر یہاں سے نکل کر ٹھنڈے اور پر فضام مقام دار“ پر جانا چاہتا ہے اور کہہ رہا ہے کہ بے شک اسے ”شوئے“ مارے جائیں، دہ ہر حال میں ”دار“ تک پہنچ کر ہی دم لے

اگلا شعر یہ تھا۔۔۔!!!

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھئے بتا تیری رضا کیا ہے

جواب تھا کہ

”یہ شعروصی شاہ کا ہے اور اس میں انہوں نے بڑی ”محارت“ سے یہ بتایا ہے کہ ہمیں چاہیے کہ ہم خود کو زیادہ سے زیادہ بلند کر لیں، اونچی اونچی بلندگیں بنائیں تاکہ خدا سے اتنے قریب ہو جائیں کہ خدا آرام سے ہم سے پوچھ لے کہ اے میرے بندے آخر تم اور لکنی“
اُنچی مبنی لیلے بنا ناجائز ہے۔۔۔؟؟؟“

اگلا شعر پھر بڑا مشکل تھا۔۔۔!!

مرہانے میر کے آہتہ بولو
اچھی تک روتے روتے سوگیا ہے

نئی تشریع کے ساتھ اس کا ایک جواب کچھ یوں ملا کہ

”اس شعر میں ”حامد میر“ نے اپنی مصروفیات کارونا رویا ہے، وہ دن بھر مصروف رہتے ہیں، رات کوئی وی پرٹاک شوکرتے ہیں، ان کی نیند بھی پوری نہیں ہوتی، ہر روز شیوکرتے ہوئے انہیں ”لک“ (زمخ) بھی لگ جاتا ہے اور اتنی زور کا لگتا ہے کہ وہ سارا دن روتے رہتے ہیں اور روتے روتے سوجاتے ہیں الہذا وہ اپنی فیملی سے کہہ رہے ہیں کہ میرے سر ہانے آہستہ بولو، مجھے ”لک“ لگا ہے۔ (منقول)

میں کل سے ”دھاڑیں مارمازگر ہنس رہا ہوں اور زار و قطار تھی ہے لگا رہا ہوں۔“
میں ایک ادارے میں ٹھپر ہوں اور میٹرک / انٹر کی اردو کی کلاس پڑھاتا ہوں، میں نے
اپنے سٹوڈنٹس کا میٹسٹ لینے کے لیے انہیں کچھ اشعار تشریح کرنے کے لیے دیے۔ جواب
میں جو سامنے آیا وہ اپنی جگہ ایک ماسٹر پیس ہے۔ املاع سے تشریح تک سٹوڈنٹس نے ایک نئی
زبان کی بندیار کھدی ہے۔ میں نے اپنے سٹوڈنٹس کی اجازت سے ان پیپرز میں سے
”نقل ماری“ ہے، اسے پڑھئے اور دیکھئے کہ پاکستان میں کیسا کیماٹیں بھرا ہوا ہے۔
سوالنامہ میں اس شعر کی تشریح کرنے کے لیے کہا گیا تھا

بنا کر فقیروں کا ہم بھیں غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں
ایک ذہین طالبعلم نے لکھا کہ

”اس شعر میں مستنصر حسین تارڑ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے انہوں نے ایک دن سوچا کہ کیوں نہ فقیر بن کے پیسے کمایا جائے، الہند اور کشکول پکڑ کر ”چونک“ میں کھڑے ہو گئے، اُسی ”چونک“ میں ایک مداری اہل کرم کا تماشا کر رہا تھا، شاعر کو وہ تماشا اتنا پسند آیا کہ وہ بھیک مانگنے کی ”باجائے“ وہ تماشا دیکھنے لگ گیا اور یوں کچھ بھی نہ کہا سکا۔۔۔!!“

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا
 میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
 ایک لاٹق طالبہ نے اس کی تشرع کا حق ادا کر دیا۔۔۔ پورے یق
 کم ”یہ شعر ثابت کرتا ہے کہ شاعر ایک کافروں گنہگار شخص ہے جو موت اور
 نہیں رکھتا اور خود کو دریا کہتا پھر بتا ہے، اس شعر میں بھی یہ شاعر یہی دعویٰ کر